بدی الجمع
محی الدین نواب

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ وہ چھوٹی باتیں کرتے ہیں تب بھی وہ بڑی باتیں کہلاتی ہیں۔ مثلاً بدیع الزماں کہتا تھا۔ "میں تو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوا ہوں۔ قبر میں بھی جاؤں گا تو وہاں کی تاریکی میں سونا ہی سونا ہو گا۔"

قبر میں تو سونا ہوتا ہی ہے۔ بدیع الزماں کی خوراک کم تھی۔ گوشت کی ایک چھوٹی سی بوٹی' آلو کا ایک قتلہ اور ایک دو سلائس لیکن کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے لذیذ کھانے ہوتے تھے۔ چکن قورمہ' بکرے کا گوشت' شامی کباب' طرح طرح کی سبزیاں' چاول تڑکا لگے ہوئے' چپاتی گرم گرم تندوری روٹیاں پھولی اور سنکی ہوئیں اور شیرمال اور جانے کیا کچھ ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانے والے متاثر ہوتے تھے۔ یہ ایک دن کی بات نہیں تھی۔ اچانک کئی مہمان پہنچ جائیں' تب بھی کھانا کم نہیں پڑتا تھا۔ کھانے کے اوقات میں ہمیشہ کئی طرح کی ڈشیں نظر آتی تھیں۔ صرف ایک کھانے کی میز کو دیکھ کر اس کی اونچی اوقات کا پتا چل جاتا تھا۔

روز مہمان نہیں آتے تھے اس لیے بچے ہوئے کھانے کو فریج اور ڈیپ فریزر میں رکھ دیا جاتا تھا۔ تقریباً ایک درجن ملازمین تھے' ان کے کھانے کے بعد بھی وہ کھانا بچا رہتا تھا۔ نئی ڈشوں کے لیے پچھلے بچے ہوئے کھانے کو فریج سے نکال کر باہر کتوں کو ڈال دیا جاتا تھا۔ اس وقت تک کھانوں میں سڑاند پیدا ہو جاتی تھی۔ میونسپلٹی والے اس کھانے کو کچرے کے ساتھ اٹھا کر ایسی جگہ پھینکتے تھے' جہاں کھاد بنائی جاتی تھی۔ اس کھاد سے پھر اناج کی فصل ہوتی تھی اور وہ اناج پھر بدیع الزماں اور اس کے مہمانوں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

یہ ایک مثال ہے ورنہ انسان اپنی زندگی میں اپنی ہی پھینکی ہوئی اور تھوکی ہوئی

چیزوں کو از سرِ نو تازہ کر کے انہیں استعمال کرتا ہے۔ ٹین ڈبے اور بھوسی ٹکڑے والے گلی گلی گھوم کر جو سامان جمع کرتے ہیں' وہ ایسی جگہ پہنچاتے ہیں جہاں سے وہی سامان دو نمبر تازہ مال بن کر مارکیٹ میں آجاتا ہے۔

بدیع الزماں کو یہ فخر تھا کہ وہ دولت اور سماجی و سیاسی حیثیت میں دوسروں سے برتر ہے۔ جہاں کمتری کا خدشہ ہو' وہاں وہ برتری حاصل کرنے کے لیے ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا اور حکمتِ عملی کے ایسے سڑے گلے مراحل سے گزرتا تھا کہ نمبرون کہلاتا تھا۔ کوئی سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ اندر سے دو نمبر ہے۔

ریس کے میدان میں وہ ایسے گھوڑے پر رقم لگاتا تھا جو دوڑ میں اول آتا تھا۔ ریس کورس کی انتظامیہ سے لے کر گھوڑے دوڑانے والے ایک ایک جوکی سے اس کے اچھے تعلقات تھے۔ ریس کے آغاز سے پہلے ہی اسے نوے فیصد یقین ہو جاتا تھا کہ کون سا گھوڑا اول آنے والا ہے پھر وہ جیت کر بڑے فخر سے کہتا تھا "میں زندگی کے ہر میدان میں اول رہتا ہوں۔ ہار جیت کو مقدر کا معاملہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ جیت ہمیشہ عقل اور صحیح حکمتِ عملی سے ہوتی ہے۔"

وہ پبلک ریلیشن کے ذریعے کسی بھی شعبے میں دور تک پہنچ کر وہاں سے اندر کی بات نکال لاتا تھا۔ ایسا کرنے میں اسے بڑی بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی تھی وہ خرچ کرنے کے معاملے میں حاتم طائی تھا۔ اوپر سے لے کر نیچے تک اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب ہی اسے سلام کرتے تھے۔

سانسیں لے کر تو سب ہی جیتے ہیں لیکن بدیع الزماں جیسے بڑے لوگ خاندانی مرتبے اور دولت کے رعب و دبدبے کی آکسیجن سے زندہ رہتے ہیں۔ ساری عمر یہی کوشش ہوتی ہے کہ اس آکسیجن میں کمی نہ ہونے پائے۔

ایک بہت بڑی تقریب میں طرح طرح کے پکوانوں کے لیے بہترین کھانا پکانے والوں کی ضرورت تھی۔ تین رئیسوں کا دعویٰ تھا کہ ان کا باورچی بہترین اور لذیذ کھانے تیار کرتا ہے۔ لہٰذا تینوں گھروں سے باورچی آئے اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈشیں تیار کیں۔ اس تقریب میں سیکڑوں مہمان آئے تھے۔ سب ہی ڈشیں ایک سے بڑھ کر ایک

تھیں لیکن سلیمان دانے والا کے باورچی کی ایک میٹھی ڈش کو سب نے پسند کیا اور اس باورچی کو اچھی خاصی ٹپ بھی دیتے رہے۔

بدیع الزماں اور اس کی بیگم نے توہین محسوس کی۔ اس کے احساسِ برتری کو ٹھیس پہنچی تھی۔ اس نے گھر پہنچ کر اپنے باورچی کو ڈھیر ساری گالیاں دیں۔ اپنے تگڑے ملازموں کے ذریعے اس کی خوب پٹائی کرائی۔ اسے اتنا مارا کہ کئی جگہ سے بے چارے کے جسم کی کھال پھٹ گئی۔ عزت بڑی مشکلوں سے بنائی جاتی ہے۔ اس تقریب میں آنے والے سیکڑوں معززین نے اگرچہ اسے شرمندہ نہیں کیا تھا لیکن اس نے اپنی سبکی محسوس کی تھی۔

کسی سے کم تر رہنا' اس کے لیے ایک گالی تھی.......... اس نے اس باورچی کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔ دوسرے دن سلیمان دانے والا کے باورچی کو دگنی تنخواہ کا لالچ دے کر اپنے کچن میں بلا لیا۔ سلیمان دانے والا نے شکایت کی۔ "بدی بھائی! یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ایک تو اچھے باورچی نہیں ملتے ہیں۔ جو میرے پاس تھا' اسے آپ نے چھین لیا۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "میں نے پہلے ہی سمجھایا ہے کہ مجھے بدی بھائی نہ کہا کریں۔ میرے نام میں "ع" ہے مگر آپ "ع" سے بدیع نہیں بول سکیں گے۔ مجھے زماں بھائی کہا کریں۔"

ہر شخص میں کوئی کمزوری' کوئی عیب یا اس کی کوئی چڑ ضرور ہوتی ہے۔ بدیع الزماں کو یہ سوچ کر غصہ آتا تھا کہ والدین نے اس کا نام بدیع الزماں کیوں رکھا؟ لوگ کبھی پورے نام سے نہیں پکارتے تھے اور جب اسے پکارتے تھے تو ایسا لگتا تھا' برائی کو مخاطب کر رہے ہیں۔ وہ ہر ایک کو ٹوک دیا کرتا تھا کہ اسے بدیع صاحب نہیں زماں صاحب کہاں کریں۔

اس کی شخصیت کا رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ بڑے وسیع اختیارات کا مالک تھا۔ مخالفین بھی دھونس میں آکر اسے زماں صاحب کہتے تھے لیکن پیٹھ پیچھے بدی ہی کہا کرتے تھے اور اس انتظار میں رہتے تھے کہ وہ کبھی الیکشن ہارے گا اور اس کے کالے دھن کا محاسبہ ہو گا

اور وہ قانون کی گرفت میں آئے گا تو اس کے.......... سامنے اسے بدی کہیں گے۔

لیکن وہ بڑا کائیاں تھا۔ ہمیشہ آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں کامیاب ہوتا تھا اور جس سیاسی پارٹی کے حکومت بنانے کے امکانات ہوتے تھے اس کی طرف لڑھک جاتا تھا۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتا تھا کہ اسے اپنے اونچے مقام سے ایک پائدان بھی نیچے جانا پڑے۔ اس نے اپنی زندگی میں جتنے زینے بنائے تھے' وہ اوپر جانے کے لیے تھے۔ پھسل کر گرنے کے لیے نہیں تھے۔

بعض قدرتی معاملات ایسے ہوتے ہیں جن سے نمٹنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا ہے لیکن بدیع الزماں فولادی ارادوں کا مالک تھا۔ وہ ایسے حالات سے بھی جنگ جاری رکھتا تھا اور کبھی ہار ماننے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اپنی ہر سانس کے ساتھ جنگ جاری رکھتا تھا۔

اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ نام رئیس الزماں تھا۔ چونکہ وہ بھی منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا تھا اس لیے تمام عادتیں رئیسوں جیسی تھیں۔ بالکل باپ پر گیا تھا لیکن باپ جیسی ذہانت نہیں تھی۔ وہ چالاک بننے کی کوشش کرتا تھا لیکن ذہانت کے بغیر چالاکی بھی نہیں آتی۔

اسے تعلیم سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہر سال اس کے مارکس خراب آتے تھے لیکن باپ اپنے ذرائع استعمال کر کے اسے ہر سال ایک کلاس آگے بڑھا دیتا تھا۔

یہ بھی ناک کا مسئلہ تھا۔ دوسرے رئیس زادے زیادہ مارکس حاصل کرتے تھے۔ اول اور دوم بھی آتے تھے۔ ان کے مقابلے میں بدیع الزماں اپنے بیٹے رئیس کو یو کے یا امریکا بھیج سکتا تھا لیکن وہاں کے تعلیمی اداروں میں اس کے اختیارات کام نہیں آسکتے تھے اور نہ ہی رشوتیں دے کر بڑی سے بڑی سند حاصل کی جا سکتی تھی۔ اس لیے وہ پاکستان میں ہی اس کی تعلیم جاری رکھ سکتا تھا۔

یوں دیکھا جائے تو اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ تعلیم حاصل کرنا ضروری نہیں تھا لیکن اب جاگیرداروں کی بقا اسی میں تھی کہ وہ سیاست میں رہیں۔ سیاست کے لیے تعلیم لازمی تھی اور تعلیم جیسی بھی ہو' تعلیم یافتہ ہونے اور بڑی بڑی اسناد کا اعزاز حاصل کرنا ضروری تھا۔

بدیع الزماں اور بیگم زماں ایک معمولی باورچی کی کمتری برداشت نہیں کر پائے تھے پھر اپنے لاڈلے اکلوتے بیٹے کو کسی سے کم تر ہوتے کیسے دیکھ سکتے تھے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے لوگ اپنی سوسائٹی میں کسی کے سامنے نظریں نہیں جھکا سکتے تھے۔

بدیع الزماں نے نویں جماعت تک اپنے بیٹے کو ہمیشہ دوسرے رئیس زادوں کے برابر رکھا اور کبھی ان سے زیادہ ٹاپ پوزیشن پر رئیس کو امتحان میں پاس کرایا۔ اس کے بعد اچانک گڑبڑ ہوگئی۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا۔ اقتدار میں رہنے والے تمام سیاست داں اپنے گھروں میں بیٹھ گئے۔ فوج نے ایسی سختی کی کہ کسی بھی شعبے میں کسی بھی سیاست داں کی فون کال کی پذیرائی نہیں ہوتی تھی۔ کوئی لیڈر سفارش کے لیے کوئی پرچی لکھ کر بھیجتا تو وہ پرچی ردی کی ٹوکری میں ڈال دی جاتی تھی۔

ایسے میں مسئلہ پیدا ہوا کہ تعلیمی معاملات میں رئیس الزماں کی اونچی پوزیشن کو کس طرح بحال رکھا جائے۔ وہ دسویں میں فیل ہو گا تو سوسائٹی میں ناک کٹ جائے گی۔ پول کھل جائے گا کہ ان کا بیٹا اب تک ذہانت سے نہیں' سیاست بازی سے امتحانات پاس کیا کرتا تھا۔

ملکی اسمبلی ایک پناہ گاہ تھی۔ وہاں لوگ بیٹھ کر اپنے اور اپنی اولاد کے تمام معاملات آسانی سے نمٹا لیے کرتے تھے۔ اس پناہ گاہ میں بڑا تحفظ تھا' کوئی ان کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ان لوگوں کو اقتدار کے جانے کا زیادہ افسوس نہیں تھا' اختیارات کے جانے کا بہت صدمہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا' جیسے بدن سے لباس اتر گیا ہے' صرف لنگوٹ رہ گئی ہے۔

ایسے میں جھنجلاہٹ طاری ہوتی ہے۔ صرف غیروں پر نہیں' اپنوں پر بھی غصہ آتا ہے۔ بدیع الزماں نے غصے سے پہلی بار اپنے بیٹے کی خوب پٹائی کی۔ بیگم اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے آئی تو اسے دھکا دے کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لاڈ پیار نے اسے کہیں کا نہ رکھا۔ بچپن سے اس پر سختی کرتیں تو آج یہ کسی قابل ہوتا۔ میں بھول گیا تھا کہ اقتدار اور اختیارات ہمیشہ کسی ایک کے پاس نہیں رہتے۔ فی الحال ہم نے ہارتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہارا۔ دولت' عزت' خاندانی وقار اور رعب و دبدبہ سب کچھ ہے۔ ابھی یہ کوئی نہیں جانتا کہ ہمارا بیٹا نالائق ہے لیکن جب بورڈ کے امتحانات میں بیٹھے گا

تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ہمارے برابر کے لوگ طعنے دیں گے اور ہم انہیں جواباً کچھ نہیں کہہ سکیں گے۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ کے چیخنے چلّانے سے یہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوگا۔ آج آپ کے پاس اختیارات نہیں ہیں مگر دولت کی کمی تو نہیں ہے۔ اس ملک میں رشوتیں دینے سے ہر کام ہو جاتا ہے۔ آپ بورڈ کے اہم عہدیداروں سے کچھ لین دین تو کریں۔"

"تم کیا سمجھتی ہو' میں خاموش بیٹھا ہوا ہوں۔ میں نے بورڈ کے اعلیٰ افسر سے فون پر بات کی تھی۔ اسے ہوٹل میں ڈنر کے لیے مدعو کیا تھا لیکن اس نے معذرت کرلی۔ کہنے لگا کہ وہ سوائے دفتر کے کسی دوسری جگہ ملاقات نہیں کر سکے گا۔"

"ہم ضرورت مند ہیں۔ ہمیں اس کے دفتر جانا چاہیے۔"

"میں گیا تھا۔ میں نے بیٹے کی خاطر اپنے بلند مرتبے کا بھی خیال نہیں کیا۔ دفتر میں جا کر اس سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ اس جیسے تمام بڑے سرکاری عہدیداروں کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر کسی سیاست داں سے ملاقات کی جائے تو ان سے سوالات کیے جاتے ہیں کہ وہ ملاقات کس نوعیت کی تھی اور ایک سرکاری عہدیدار کا کسی سیاست داں سے کیا تعلق ہے۔

"میں نے اس سے کہا کہ اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ صوبے بھر میں اول نہ آئے تو کم از کم اے گریڈ حاصل کر لے۔ اگر ایسا ہو جائے تو میں اس کو بلینک چیک دستخط کر کے دوں گا۔

"اس نے کہا کہ خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کریں۔ رشوت لینے والے کو کوڑے مارے جاتے ہیں اور اس کی کوڑے کھانے کی عمر نہیں ہے۔"

سیدھی سی بات ہے۔ سیاست دانوں کی عمر صرف پانچ برس کی ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی دو برس یا چھ ماہ ہی میں لڑھک جاتا ہے۔ آزاد امیدوار پٹڑی بدل کر پانچ برس سے بھی زیادہ جی لیتے ہیں۔ بدیع الزماں طرح طرح سے اپنی سیاسی عمر بڑھاتا چلا آ رہا تھا۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اچانک مارشل لاء اسے سرکاری عہدیداروں کے سامنے بے بس اور مجبور بنا دے گا۔ اب کسی بھی شعبے کے عہدیدار اس کے آگے گھاس نہیں

ڈالتے تھے۔ کئی عہدیداروں نے اسے تسلیاں دیں' ذرا صبر کریں۔ مارشل لاء ہمیشہ نہیں رہے گا پھر آپ کی باری آئے گی۔

پتا نہیں کب باری آنے والی تھی۔ اس کا بیٹا رئیس الزماں باغی ہو گیا تھا۔ باپ نے پہلی بار اس کی پٹائی کی تھی۔ اس نے پٹائی کے جواب میں پہلے گھر میں توڑ پھوڑ شروع کی پھر رائفل اور.......... گاڑی لے کر گھر سے نکل گیا۔

بڑے گھروں کے رئیس زادوں کے بڑے خطرناک مشاغل ہوتے ہیں۔ وہ مہنگی سے مہنگی کاریں خرید سکتے ہیں لیکن دوستوں سے ریس لگانے کے لیے موٹر سائیکل دوڑاتے ہیں اور سائلنسر نکال دیتے ہیں تاکہ گاڑی بے انتہا شور مچائے۔ ان کے آنے اور گزرنے کی دہشت طاری کرے۔ کبھی کبھی ہوائی فائرنگ بھی کرتے ہیں۔ کبھی کسی رئیس زادی کے لیے دو رقیب لڑتے ہیں تو دو تین مختلف پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ ان کے درمیان کاؤنٹر فائرنگ ہوتی ہے تو تھانے والوں کی بن آتی ہے۔ ان کے والدین بڑی بڑی رقمیں دے کر ایسے معاملات کو اچھلنے اور اخبارات تک پہنچنے سے روک دیتے ہیں۔

بیگم زماں گھبرائی ہوئی تھی کہ پتا نہیں بیٹا ہتھیار اور گاڑی لے کر کہاں گیا ہے؟ کوئی واردات تو ضرور کرے گا لیکن وہ آدھی رات کے بعد شراب کے نشے میں لڑکھڑاتا ہوا آگیا۔ باپ نے اس کی حالت دیکھی۔ سنجیدگی سے سوچا پھر دوسرے دن اسے سمجھایا۔

"ہتھیار اور طاقت سے ہر کام نہیں نکلتا۔ اندر کا غصہ بھی نہیں نکلتا۔ میں نے پچھلی رات ہی معاملہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ لڑکی کے ماں باپ لالچی تھے۔ پچاس ہزار میں کام ہو گیا۔ اگر تمہیں یہی کرنا ہے تو ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں بیٹے کے بغیر جی سکتا ہوں' عزت کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

بیٹے نے سر جھکا کر کہا۔ "سوری ڈیڈ! میں نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے۔"

"آج میری ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ ہم صدیوں سے جاگیردار ہیں۔ پاکستان بننے کے بعد ہماری جاگیرداری کی بقا اسی میں تھی کہ ہم سیاست داں بن جائیں اور سیاست داں اوپر سے کبھی دہشت گرد نہیں ہوتا۔ اندر سے ہوتا ہے اور اوپر سے میٹھا مسلمان دکھائی دیتا ہے۔ اگر میری طرح دولت' عزت اور شہرت کمانا چاہتے ہو تو دماغ ٹھنڈا رکھو اور میں

جیسا کہتا ہوں' ویسا کرتے جاؤ اور یہ سیکھتے جاؤ کہ ہم ناممکن کو ممکن کیسے بنا لیتے ہیں۔"

"آئندہ آپ جو کہیں گے' میں اسی پر عمل کروں گا۔"

"تو پھر آج سے زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں گزارو۔ ابھی بورڈ کے امتحانات کے لیے دس ماہ باقی ہیں۔ تمہیں بہترین ٹیوٹر آکر پڑھائیں گے۔ تمہارا ذہن جس حد تک کام کرتا ہے' تم اسی حد تک ذہانت سے کام لو۔ میں اس دوران میں کچھ ایسا کروں گا کہ تمہارا اے گریڈ آسکے۔"

بدیع الزماں یہ نہیں جانتا تھا کہ مارشل لاء کب تک رہے گا اور نئے الیکشن کب تک ہو سکیں گے۔ فی الحال سیاست اہم نہیں رہی تھی۔ اس نے جو دولت' عزت اور شہرت کمائی تھی' وہ برقرار تھی۔ اونچی سوسائٹی میں اپنے برابر کے رئیسوں سے جوڑ توڑ جاری تھا۔ کرکٹ کا کھیل ہو یا اپنی اولاد کی تعلیم کا معاملہ ہو' ان کے درمیان لاکھوں روپے کی شرطیں لگائی جاتی تھیں کہ فلاں ٹیم جیتے گی یا ہمارا بیٹا امتحانات میں اے گریڈ حاصل کرے گا۔ بورڈ کے امتحانات میں بدیع الزماں نے اپنے بیٹے رئیس الزماں پر ایک لاکھ روپے کی شرط لگائی تھی۔

شرط لگانے والوں میں چھ رئیس تھے۔ یعنی چھ لاکھ روپے کی شرط تھی۔ ان میں سے کسی ایک کے بیٹے یا بیٹی کو زیادہ مارکس حاصل کرکے اے گریڈ حاصل کرنا تھا۔ جس کا بیٹا یا بیٹی امتحانات میں ٹاپ کر لیتے' اسے پانچ لاکھ حاصل ہو جاتے۔

ویسے ان رئیسوں کے لیے پانچ لاکھ روپے صرف پانچ روپے کے برابر تھے۔ اصل مسئلہ ناک کا تھا کہ چھ میں سے کس کی ناک اونچی رہے گی؟ بدیع الزماں کئی بار یہ دعوے کر چکا تھا کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اول رہتا ہے۔ وہ ہار جیت کو مقدر کا معاملہ نہیں سمجھتا تھا۔ اکثر یہی کہا کرتا تھا کہ جیت ہمیشہ حکمتِ عملی سے ہوا کرتی ہے۔ اس کے لیے ذہانت لازمی ہے۔

اس نے بیٹے کو لگام دینے کے بعد مہنگے سے مہنگے تجربے کار ٹیوٹرز رکھ لیے لیکن وہ یہ جانتا تھا کہ بیٹے کے پاس اے گریڈ والی ذہانت نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ محنت کرے' تب بھی شاید بی گریڈ حاصل کر سکے گا۔

دوسرے رئیس آپس میں تبصرے کرتے تھے کہ بدیع الزماں اپنے دورِ اقتدار میں بیٹے کو ہر سال فرسٹ پوزیشن میں رکھا کرتا تھا۔ اب اس کے پاس اختیارات نہیں رہے تھے اور جو کام اختیارات سے ہو جاتا ہے' وہ دولت سے کبھی نہیں ہوتا۔ اس بار یقیناً سب کے سامنے اس کی ناک نیچی ہوگی۔

بدیع الزمان دو دنوں اور دو راتوں تک نگاہوں کے سامنے خیالی شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھا رہا اور طرح طرح کی چالیں چلتا رہا لیکن کوئی چال کامیاب ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی پھر اس نے شطرنج ایک طرف رکھ دی۔ بیٹے کی کامیابی کے لئے چور دروازے تلاش کرنے لگا۔

چور دروازہ ایسے ہی وقت تلاش کیا جاتا ہے اور اگر یہ دروازہ نہ ملے تو بنا لیا جاتا ہے۔ اس نے دوسرے دن اخبارات میں ایک اشتہاری پیغام شائع کرایا۔ پیغام کچھ یوں تھا۔

"ہمارے ملک میں ذہین اور باصلاحیت طلبہ و طالبات کی کمی نہیں ہے۔ وہ غربت یا دیگر مجبوریوں کے باعث پرائمری کلاس سے آگے نہیں پڑھ پاتے۔ ایسے طالب علم جو نویں جماعت پاس کرچکے ہیں لیکن ناگزیر حالات کی بنا پر بورڈ کے امتحانات کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے' ان کے اخراجات میں برداشت کروں گا لیکن شرط یہ ہے کہ انہوں نے نویں جماعت کے امتحانات میں اے گریڈ کے زیادہ سے زیادہ مارکس حاصل کئے ہوں۔ ایسے طلبہ و طالبات مندرجہ ذیل پتے پر اپنی نویں جماعت کی مارکس شیٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں روانہ کرسکتے ہیں۔ یہ سلسلہ ہر سال قائم رہے گا اور ہر سال صرف تین غیر معمولی ذہین طلبہ و طالبات کے اخراجات پورے کئے جائیں گے۔"

بدیع الزمان نے اس اشتہاری پیغام میں پوسٹ بکس نمبر شائع کرایا تھا۔ اس کے جواب میں سینکڑوں خطوط آنے لگے۔ ان خطوط میں پہلی جماعت سے لے کر نویں جماعت تک کی مارکس شیٹ کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں تھیں۔ ان سے پتا چلتا تھا کہ کون طالب علم کس قدر ہونہار ہے۔ نو برس تک ہر سال اول پوزیشن حاصل کرنے والوں میں سے تین طلبہ کا انتخاب کیا گیا۔ ان میں سے ایک طالب علم فہیم الزماں تھا۔ اس نے باقی دو کے مقابلے

میں اول آنے کے علاوہ بہت زیادہ مارکس حاصل کیے تھے اور اس کے ساتھ اس کے اسکول کے اساتذہ کی تعریفی سندیں بھی تھیں۔

بدیع الزماں نے اپنے سیکریٹری سے کہا۔ "سب سے پہلے فہیم اور اس کے باپ کو بلاؤ۔ میں ان سے تنہائی میں کچھ ضروری باتیں کروں گا۔"

فہیم کے خط میں اس کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ سیکریٹری اس پتے پر روانہ ہو گیا۔

☆=========☆=========☆

وہ بوڑھا چارپائی پر بیٹھا پرانے میلے لحاف میں لپٹا ہوا کھانس رہا تھا اور تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ اس کی بیوی صابرہ نے سرہانے تکیے پر غلاف چڑھا کر کہا۔ "لیٹ جاؤ۔ یہ کم بخت کھانسی اور بخار تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔ پتا نہیں ڈاکٹر دوا دیتا ہے یا پانی؟ شیشی میں تو لال رنگ کا پانی ہی دکھائی دیتا ہے اور وہی سفید' نیلی پیلی گولیاں ہوتی ہیں۔ بیماری بڑھتی ہے پھر بھی دوائیں نہیں بدلتا۔"

بوڑھے نے کھانستے ہوئے لیٹ کر کہا۔ "کچی آبادیوں میں ایسے ہی ڈاکٹر ہوا کرتے ہیں۔ یہ سب نیم حکیم ہوتے ہیں۔ کمانڈری کرتے کرتے ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔"

چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی اس کی بیٹی نازو نے کہا۔ "ابا! کمانڈری نہیں کمپاؤنڈری کرتے کرتے ڈاکٹر بن جاتے ہیں۔ سات روپے میں تین خوراک دیتے ہیں۔ اس سے سستا علاج اور کیا ہو گا؟ یہ ڈاکٹر ڈوبنے والے کو کنارے نہیں لگا سکتے لیکن تنکا بن کر سہارا دے دیتے ہیں۔"

بوڑھے نے کہا۔ "تاجو (نازو) ٹھیک کہتی ہے۔ یہ ڈاکٹر ہمیں بیماری سے مرنے نہیں دیتے۔ پوری جندگی بھی نہیں دیتے بس ہم جیسے ہیں' ویسے ہی ہمیں جندہ رکھتے ہیں۔"

صابرہ نے کہا۔ "صرف دوائیں کافی نہیں ہوتیں۔ پیٹ کے لیے اناج اور ڈھانپنے کے لیے کپڑا بھی جروری ہوتا ہے۔ ایک بیٹا ہے' وہ کیا کرے گا؟ صبح سے بارہ بجے تک سبجیوں کا ٹھیلا لیے گلی گلی گھومتا ہے۔ ایک بجے اسکول جاتا ہے۔ یہ آخری سال ہے۔ پتا نہیں بورڈ کا امتحان دے پائے گا یا نہیں؟"

بوڑھے نے کہا۔ "جتنا پڑھنا تھا' پڑھ لیا۔ ہم باپ دادا کے جمانے سے محنت

مجدوری کرتے آ رہے ہیں۔ اسے بھی یہی کرنا ہے۔"

"میں جہاں جاتی ہوں' وہاں اپنے بیٹے کی تعریفیں سنتی ہوں۔ وہ ٹھیلے والا کہہ رہا تھا' لڑکا اسی طرح پڑھتا رہا تو ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا۔"

"بچپن سے سنتا آ رہا ہوں کہ گدڑی میں لعل ہوتا ہے لیکن آج تک لعل نہیں دیکھا۔ یہ لعل جو پیدا ہو گیا ہے' اسے سبجیاں ہی بیچنے دو۔"

باہر ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ٹین کی چھت سے کئی جگہ پانی ٹپک رہا تھا۔ صابرہ نے پریشان ہو کر کہا۔ "میرا بیٹا ٹھیلا لے کر گیا ہے۔ پانی میں بھیگ رہا ہو گا۔"

"بیٹا تگڑا جوان ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ بھیگنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ البتہ فائدہ ہو گا۔ بارس میں سبجیاں بھیگنے سے تر و تازہ لگتی ہیں۔ کوئی گاہک باسی ہونے کی شکایت نہیں کرے گا۔"

اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ باپ نے کہا۔ "لو نام لیتے ہی آ گیا۔ معلوم ہوتا ہے' بارہ بج چکے ہیں۔ اب وہ ٹھیلا یہاں چھوڑ کر اسکول جائے گا۔"

ماں نے آنگن میں جا کر دروازہ کھولا۔ وہ ٹھیلے کو دھکیلتے ہوئے اندر آ کر بولا۔ "ابا کی طبیعت کیسی ہے؟"

"ویسی ہی ہے۔ نصیب کی کھرابی ہے۔ ہمارے گھر میں جو چیج بگڑتی ہے پھر وہ اچھی نہیں ہوتی۔ چھت پر کتنی بار تارکول لگایا ہے پھر بھی کہیں نہ کہیں سے پانی ٹپکتا ہی رہتا ہے۔ تو اپنی حالت دیکھ' کیسے بھیگ رہا ہے۔ جا کپڑے بدل لے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "تم نہ بھی کہو تو وہ کپڑے بدل کر اسکول جائے گا۔ بیکار ممتا نہ دکھاؤ۔"

بیٹے نے کہا۔ "ابا! آپ کو تو میری تعلیم سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ کیا میں آپ پر بوجھ بنتا ہوں؟ ٹیوشن پڑھا کر اپنا خرچ پورا کرتا ہوں۔"

نازو نے چولھے کے پاس سے کہا۔ "بھائی گرما گرم روٹیاں ہیں۔ آ کر کھا لو۔ کل تم بھوکے چلے گئے تھے۔ آج نہیں جانے دوں گی۔ پہلے کھانا پھر اسکول جانا۔"

"ابھی آ کر کھاتا ہوں۔ ویسے آج اسکول نہیں جاؤں گا۔ کل شام ہمارے ایک ٹیچر کا

انتقال ہو گیا تھا۔ آج اسکول بند رہے گا۔"

بوڑھے نے کہا۔ "اللہ! تیرا شکر ہے۔ کیا ہر روز ایک ٹیچر نہیں مر سکتا؟"

صابرہ نے کہا۔ "اے توبہ کریں۔ ہم سب کو اللہ کے آگے جان دینی ہے۔ جو منہ میں آتا ہے' بک دیتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے بیٹے کا کیا بگاڑا ہے؟"

"سبزیاں بیچ کر چار پیسے لاتا ہے۔ اگر یہ پورے دن پھیری لگائے تو پیسے ہی پیسے آجائیں گے۔"

وہ لباس تبدیل کر کے نازو کے پاس آیا پھر چولھے کے پاس بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ نازو نے کہا۔ "بھائی! بیماری اور بڑھاپے نے ابا کو چڑ چڑا بنا دیا ہے۔ ان کی باتوں کا برا نہ مانو۔ ایک کان سے سنو' دوسرے کان سے نکال دیا کرو۔"

"یہی کرتا ہوں۔ اللہ نے دوسرا کان اسی لیے دیا ہے ورنہ صرف سننے کے لیے ایک ہی کان کافی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ اس نے کہا۔ "باجی! دراصل ابا کو تمہاری فکر ہے۔ سسرال والے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ اب تمہاری رخصتی ہو جانی چاہیے۔ وہ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔ نکاح پڑھوائے ہوئے تین برس ہو چکے ہیں۔"

وہ اپنے سر پر آنچل رکھ کر بولی۔ "نصیب میں جو ہو گا' وہی ہو گا تم کھانا کھاؤ۔"

وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر صابرہ سے بولا۔ "سن رہی ہو۔ ادھر دونوں بہن بھائی کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ مجھے بڑھا چڑ چڑا کہہ رہے ہوں گے۔ میں انہیں دن رات باتیں سناتا رہتا ہوں۔ جس دن میری آواج بند ہو جائے گی اس دن پتا چلے گا کہ باپ کیا ہوتا ہے؟"

"تمہارا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رہے.......... تم الٹی سیدھی باتیں نہ کیا کرو۔"

"کیوں نہ کروں۔ جو ہونے والا ہے وہ آنکھوں کے سامنے نجر آرہا ہے۔ میرے بعد یہ ٹھیلا رہ جائے گا۔ اسی میں وہ سبزیاں بیچے گا اور اسی ٹھیلے پر بہن کو بٹھا کر رُخصت کرے گا۔ ہماری اوقات یہی ہے۔"

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ نازو نے کہا۔ "بھائی! روٹی تو کھالو۔"

"بس پیٹ بھر گیا۔"

وہ دوسرے کمرے میں ماں باپ کے سامنے سے گزر کر آنگن میں آیا اور ٹھیلا لے جانے لگا۔ ماں دوڑ کر آئی۔ "ارے پیٹ بھر کر تو کھالے۔ ذرا آرام تو کرلے۔"

"اماں! بارش بند ہو گئی ہے۔ یہ مال بیچنے کا اچھا وقت ہے۔ بیٹیاں اور سبزیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ گھر میں پڑی رہیں تو مرجھا جاتی ہیں۔"

وہ ٹھیلا نکال کر گھر سے باہر آگیا۔ دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگا۔ "یا اللہ! ابا کی بیماری دور کر دے۔ باجی کی رخصتی کر دے۔ تُو اتنی بڑی دنیا کا کاروبار چلاتا ہے۔ ہماری صرف دو مشکلوں کو آسان کر دے آمین۔"

وہ محلے سے نکل کر دوسرے محلے کی گلیوں میں گھوم کر آوازیں لگانے لگا۔ "سبزی لے لو سبزی۔ آلو' ٹماٹر' گوبھی' مٹر تازہ سبزیاں ہیں۔ تازہ تازہ مال ہے۔ میں تو دروازے دروازے آیا ہوں۔ آپ کیچڑ پانی میں کہاں جائیں گے؟ سبزیاں خرید لیں۔ تازہ سبزیاں.........."

کسی گھر سے عورتیں اور کسی گھر سے مرد نکل کر اپنی ضرورت کے مطابق کچھ نہ کچھ خریدنے لگے۔ وہ ایک گلی سے دوسری گلی جاتا رہا۔ جان پہچان والے پوچھنے لگے۔ "تُو تو شاید پڑھنے جاتا تھا اور باپ سبزیاں بیچتا تھا۔ وہ کہاں ہے؟"

"ابا بیمار ہے۔ وہ تندرست ہو جائیں گے تو میں کوئی دوسرا کام کروں گا۔"

پھر وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "اب تو کام ہی کرنا ہو گا۔ بورڈ کے امتحان میں بیٹھنے کے لیے رقم کی ضرورت ہے لیکن اگر یہی رقم میں جمع کرلوں تو باجی کی رخصتی پر کام آئے گی۔"

وہ آوازیں لگاتا ہوا اور سبزیاں بیچتا ہوا ایک اور محلے میں آیا۔ وہاں ایک مکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دو چار گاہک اسے روک کر اپنی پسند کی سبزیاں خرید رہے تھے۔ قریب ہی کھڑکی سے ایک نسوانی آواز آرہی تھی۔ آواز میں اتنا رس تھا اور مٹھاس تھی کہ سن کر اس کی عمر کی مٹھاس کا اندازہ ہوتا تھا۔

وہ کوئی طالبہ تھی۔ اونچی آواز میں انگریزی کی ایک نظم یاد کر رہی تھی۔ اس نظم میں ماؤں پر رحمت نازل فرمانے کی دعا تھی اس دعائیہ نظم کا عنوان تھا:

"بچوں کا پالنا جھلانے والے ہاتھ ساری دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔"

"ان عورتوں کے ہاتھوں پر
اللہ کی رحمت ہو
فرشتے ان کے حوصلوں اور وقار کی
حفاظت کریں
وہ ہاتھ خواہ محلوں میں ہوں یا
شکستہ جھونپڑیوں میں
کوئی بات نہیں وہ جہاں بھی ہوں'
ان کے قریب سے طوفان گزر جاتے ہیں اور
ان ہاتھوں کی قوسِ قزح قائم رہتی ہے
کیونکہ وہ ہاتھ جو پالنے کو جھلاتے ہیں
وہ ساری دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں"

اس لڑکی نے پڑھتے پڑھتے ماں کو آواز دی۔ "امی! ماموں جان کہاں ہیں؟"

"کہیں محلے میں گئے ہوں گے۔ تجھے پڑھتے پڑھتے ماموں کیوں یاد آ رہے ہیں؟"

"دیکھیں نا امی! ماں کی جتنی تعریفیں کی جائیں کم ہیں۔ میں یہ تو سمجھ گئی کہ ماں کے ہاتھوں کو حوصلہ مند اور مستحکم کیوں کہا گیا ہے۔ ان ہاتھوں کی خوب صورتی کو قوسِ قزح کہا گیا ہے اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن دسویں جماعت کی اس کتاب میں ایک بچکانہ سی بات کہی گئی ہے کہ آسمان پر نظر آنے والی قوسِ قزح کے آخری سرے پر خزانہ ملتا ہے۔ یہ حقیقت تو نہیں ہے' محض بچوں کو قصے کہانیوں کی طرح بہلانے والی بات ہے۔"

گاہک جا چکے تھے' وہ بھی جانے والا تھا لیکن رک گیا۔ کھڑکی سے ذرا قریب ہو کر بولا۔ "بی بی جی! لٹریچر کو الفاظ کے سطحی معنوں سے نہیں بلکہ بین السطور سے سمجھا جاتا

ہے۔ ماں کے قوسِ قزح جیسے خوب صورت ہاتھوں کے آخری سروں پر وہ پالنا ہوتا ہے' جس پر بچہ جھولتا ہے۔ یہ بچہ جوان ہو کر علم و ہنر حاصل کر کے ملک و ملت کے لیے خزانہ بن جاتا ہے۔"

ماں ذرا دور کچن میں تھی۔ وہ طالبہ کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے تو توجہ سے وہ باتیں سنیں پھر بولنے والے کو دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پاس آ کر پردے کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ ایک سبزیاں بیچنے والا جوان آواز لگا رہا تھا۔ "آلو' ٹماٹر' سیم اور پالک ہیں۔ تازہ تازہ سبزیاں لے لو۔"

وہ آوازیں لگا کر ٹھیلے کو دھکیلتے ہوئے لے جانے والا تھا۔ اسی وقت ایک عورت آ کر اسے روک کر سبزیاں خریدنے لگی۔ وہاں اور کوئی مرد نہیں تھا۔ سبزی والے کی آواز اسی آواز سے ملتی جلتی تھی جو قوسِ قزح اور ایک بچے کے جوان ہونے کا موازنہ کرتے ہوئے ایک ماں کی عظمت کی وضاحت کر رہی تھی۔

وہ حیرانی سے سوچنے لگی۔ "کیا اس سبزی بیچنے والے نے ایک عام قصہ کہانی اور لٹریچر کے فرق کو سمجھایا ہے۔ بخدا ایک ہی فقرے میں اتنی وضاحت سے سمجھایا ہے کہ ذہن روشن ہو گیا ہے۔"

وہ جانے والا تھا۔ طالبہ نے آواز دی۔ "سنو!"

وہ رک گیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ابھی تم مجھے مخاطب کر کے بول رہے تھے؟"

"جی ہاں۔ کسی اجنبی لڑکی کو مخاطب کرنا مناسب نہیں ہے لیکن علم کو سمجھنا اور سمجھانا ایک نیک اور تعمیری عمل ہے۔"

"تم نے کتنی تعلیم حاصل کی ہے؟"

اس نے سر کو جھکایا پھر بڑی مایوسی سے کہا۔ "بی بی جی! یہ سوال نہ کریں مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔"

"تعجب ہے۔ علم کو سمجھتے بھی ہو اور علم سے تکلیف بھی پہنچتی ہے۔ اس ٹھیلے کو دیکھ کر سمجھ میں آ رہا ہے کہ تمہاری ذہانت اور صلاحیتوں کے مطابق تمہیں روزگار حاصل نہیں ہو رہا ہے۔"

"آپ نے کسی حد تک سمجھ لیا۔ شکریہ۔"

وہ جانے لگا۔ اس نے کہا۔ "سنو! اس نظم کے آخری Stanza کی دوسری اور تیسری لائنیں سمجھا سکو گے۔"

وہ بولا۔ "ہاں یہ Poem مجھے یاد ہے۔ اس کی دوسری اور تیسری لائنیں یوں ہیں۔

Song is aingled with the worship in the sky and the sacred.

"اس کی تشریح یہ ہے کہ ہم زمین پر جو دعائیں مانگتے ہیں آسمانوں پر فرشتے بھی ان دعاؤں کو دہراتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے حضور وہ دعائیں شرفِ قبولیت حاصل کریں۔"

یہ کہہ کر وہ آوازیں لگاتے ہوئے جانے لگا۔ "آلو ہیں' ٹماٹر ہیں۔ سیم اور پالک ہیں۔ تازہ تازہ سبزیاں لے لو..........."

وہ گم صم کھڑی اسے دیکھتی رہی اور حیرانی سے سوچتی رہی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی دور ہونے والی آواز بھی گم ہوتی چلی گئی۔

ماں نے کمرے میں آکر بیٹی کو کھڑکی کے پاس دیکھا پھر پوچھا۔ "باہر کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ بولی۔ "امی! یہاں ایک سبزیاں بیچنے والا لڑکا تھا۔ میں جس Poem کے معنی ماموں جان سے سمجھنا چاہتی تھی اس سبزی والے جوان نے وہی نظم پوری تشریح کے ساتھ سمجھا دی۔ کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے؟"

ماں نے کہا۔ "میں تین دنوں سے اس جوان کو دیکھ رہی ہوں۔ پہلے ایک بوڑھا بابا سبزیوں کا ٹھیلا لایا کرتا تھا۔ شاید یہ جوان اس کا بیٹا یا دور کا کوئی رشتے دار ہوگا۔"

"امی! یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں ذہانت اور علم کی قدر نہیں کی جاتی ہے۔"

"ہمارے تمہارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟ جو اس ملک کے کرتا دھرتا ہیں' انہیں سوچنا چاہیے۔ جب لڑکوں کو پڑھ لکھ کر روزگار نہیں مل رہا ہے تو لڑکیاں پڑھ کر کیا کریں گی؟ تمہیں تو اس لیے پڑھا رہے ہیں کہ علم سے ذہن روشن ہوتا ہے پھر رشتہ مانگنے والے پڑھی لکھی لڑکیاں ڈھونڈتے ہیں۔"

وہ کمرے سے ایک جھاڑو لینے آئی تھی۔ جھاڑو لے کر پھر کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ کتاب کھول کر نظم کی ان ہی دونوں لائنوں کو سمجھنے لگی۔ پہلی لائن میں وہ Song کے معنی گانا سمجھتی تھی پھر یاد آیا کہ چرچ میں انگریز ہم آواز ہو کر گیت کے انداز میں دعائیں پڑھتے ہیں۔ ہندو بھی کیرتن کرتے ہوئے بھجن گاتے ہیں۔ ایسے دعائیہ انداز کو Sacred Song کہتے ہیں۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس جوان نے سمجھایا تو سمجھ میں آیا کہ اس نظم میں گیت کے معنی دعا کے ہیں۔ مسلمان بھی مذہبی اجتماعات میں حمد اور نعت ترنم سے پڑھتے ہیں۔ اسلام اور دوسرے مذاہب کے درمیان یہ فرق ہے کہ حمد اور نعت کے دوران میں ترنم جائز ہے لیکن موسیقی میں ممنوع ہے۔

وہ سبزی والا بجلی کی طرح چمک کر گزر گیا تھا مگر وہ اپنی بات سے اور سراپا حیات سے اس طالبہ کے دل میں متصور ہو گیا تھا۔

☆=========☆=========☆

صابرہ نے اپنے شوہر کو کھانے اور پینے کے لیے دوائیں دیں پھر کہا۔ "اللہ کا شکر ہے۔ اب بکھار نہیں ہے اور طبیعت بھی سنبھلی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی بستر سے اٹھ کر چلا کرو۔ اس طرح بدن کھلتا ہے۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "تمہیں تو میں تندرست جوان دکھائی دیتا ہوں۔ مجھے کبھی بیمار نہیں سمجھو گی۔ بیماری کا بہانہ کرنے والا سمجھو گی۔ صاف کیوں نہیں کہتیں کہ ٹھیلا لے کر گلی گلی جاؤں اور تمہارے بیٹے کو اسکول جانے کی آجادی دے دوں۔"

"توبہ ہے۔ میں کہتی کچھ ہوں' تم سمجھتے کچھ ہو۔ میں تمہیں گھر کے اندر چلنے پھرنے کو کہہ رہی ہوں۔"

"جب میں سمجھوں گا کہ چلنے پھرنے کے کابل ہوں تو بستر سے اٹھوں گا۔ جاؤ یہاں سے۔"

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ کر پاؤں دابنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک سنائی دی۔ صابرہ اٹھنا چاہتی تھی۔ نازو نے کہا۔ "میں دیکھتی ہوں' کون ہے؟"

وہ کمرے سے نکل کر آنگن سے گزرتے ہوئے دروازے پر آئی پھر اسے کھولا۔ باہر

ایک شخص بہت عمدہ اور قیمتی لباس میں کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ایک خوب صورت اور قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔

اس نے کہا۔ "زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ کیا مسٹر فہیم الزماں کا مکان یہی ہے؟"

"جی ہاں۔ آپ کون ہیں؟"

"پلیز آپ انہیں بلائیں۔"

"وہ گھر میں نہیں ہیں۔ ابا ہیں۔ بھائی دو گھنٹے بعد بارہ بجے آئیں گے۔"

"کیا آپ کے ابا سے بات ہو سکتی ہے؟"

"ذرا ٹھہریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔ وہ بیمار ہیں۔"

وہ دروازہ بند کر کے دوڑتی ہوئی ماں باپ کے پاس آئی۔ خوش ہو کر بولی۔ "ایک بڑی سی کار میں ایک بڑا سا آدمی آیا ہے۔ بھائی کو پوچھ رہا ہے اور پتا ہے امی! وہ بھائی کو مسٹر کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا بھائی نہیں ہیں۔ ابا ہیں۔ وہ ابا سے ملنا چاہتا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "یہ کوئی کار والا ہمارے پاس کیوں آیا ہے۔ صابرہ! تم جاؤ۔ اس سے پوچھو کیا بات ہے؟ کام کا آدمی ہو گا تو اسے یہاں لے آؤ۔"

صابرہ اٹھ کر گئی پھر تھوڑی دیر بعد ایک صاف ستھرا قیمتی لباس پہنے ہوئے آدمی کے ساتھ آئی۔ اس نے بوڑھے سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں بدیع الزماں کا سیکریٹری ہوں۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میرا بھی یہی نام ہے اور بیٹے کا نام تو آپ جانتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ مسٹر فہیم الزماں نے ہمارے ایک اشتہار کے جواب میں اپنا بائیوڈیٹا بھیجا ہے۔ ہمارے صاحب نے ان کا انتخاب کیا ہے۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "اچھا تو میرے بیٹے کو نوکری دی جائے گی؟"

"نوکری نہیں، انہیں تعلیم جاری رکھنے اور بورڈ کے امتحانات میں بیٹھنے کے لیے مالی امداد دی جائے گی۔"

وہ بدک کر بولا۔ "آپ اسے کیوں امتحان میں بٹھائیں گے؟ کیوں اپنے پیسے دیں

گے؟ ہم سے کیا دشمنی ہے۔ بیٹا ہمیں چار پیسے کما کر دے رہا ہے۔ آپ ہمارے پیٹ پر لات مارنے آئے ہیں؟"

سیکریٹری کچھ بوکھلا سا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں خود نہیں آیا ہوں۔ صاحب زادے کی درخواست پر آیا ہوں۔"

"آپ یہاں آئے ہیں۔ بڑی مہربانی کی ہے۔ میرا بیٹا پڑھائی کے لیے امداد لے گا تو بے غیرت ہو گا۔ جوان بہن گھر میں بیٹھی ہے۔ اس کا نکاح پڑھائے تین برس ہو گئے۔ اس کی رُخصتی کے لیے ہمارے پاس رقم نہیں ہے اور میں برسوں کا بیمار ہوں۔"

نازو نے کہا۔ "ابا! آپ تو شریف آدمیوں سے بھی جھگڑنے لگتے ہیں۔ یہ فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ جب بھائی کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ وہ آپ اور گھر والوں پر بوجھ نہیں بن رہے ہیں تو آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں؟"

"وہ پڑھنے لگے گا تو سبزیاں کون بیچے گا؟ کیا یہ تمہارا بیمار باپ؟"

سیکریٹری نے کہا۔ "میں آپ کے مسائل سمجھ گیا ہوں۔ کیا آپ کی سبزیوں کی دکان ہے؟"

"ہم اتنے بڑے لوگ کہاں کہ دکان لگا کر بیٹھیں۔ ٹھیلا لے کر گلی گلی گھومتے ہیں۔"

"یہ تو آپ کے صاحب زادے کی سراسر ناقدری ہے۔ روزانہ کتنی آمدنی ہو جاتی ہو گی؟"

"یہی کوئی تیس چالیس روپے مل جاتے ہیں۔"

"بس؟ اتنے سے روپوں کے لیے آپ اس کا کیریئر برباد کر رہے ہیں۔ جو آپ کی آمدنی ہے، اس سے کچھ زیادہ رقم آپ کے صاحب زادے کو مل جایا کرے گی۔ میں اپنے صاحب سے بات کر لوں گا۔ صبح نو بجے صاحب کی کوٹھی میں اپنے صاحب زادے کے ساتھ آجائیں یا میں دونوں کو لینے کار میں آجاؤں گا لیکن آپ تو بیمار ہیں۔"

"نہیں جی۔ میں بیمار ہوں۔ جب اچھی آمدنی کی بات ہے تو میں جرور آؤں گا پھر آپ تو گاڑی لائیں گے۔ میرے کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

وہ اٹھ کر بولا۔ "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"اجی ایسے کیسے جائیں گے؟ صابرہ' صاحب جی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔"

"پلیز زحمت نہ کریں۔ مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں پھر کبھی آکر چائے پی لوں گا۔ شکریہ۔"

وہ مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد صابرہ نے کہا۔ "وہ کتنے کام کا آدمی تھا۔ تم اس سے بھی لڑنے لگے تھے۔ کبھی تو دماغ ٹھنڈا رکھا کرو۔"

"ارے تو کون سا کام بگاڑ دیا ہے۔ اسے ناراج تو نہیں کیا ہے۔ دیکھ لینا۔ کل وہ گاڑی لے کر آئے گا۔"

دونوں ماں بیٹی دل ہی دل میں دعائیں مانگنے لگے کہ فہیم الزماں کو اچھی آمدنی والا کوئی کام مل جائے۔

☆==========☆==========☆

وہ باپ بیٹے اس شاندار کوٹھی اور مسلح سکیورٹی گارڈز کو دیکھ کر ہی خاک کے کیڑوں کی طرح سکڑ گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی بادشاہ سلامت کے محل میں جانے والے ہوں اور پتا نہیں وہ اپنی اوقات کے مطابق وہاں قدم رکھ سکیں گے یا نہیں؟

اگر ان کے ساتھ بدیع الزماں کا سیکریٹری نہ ہوتا تو وہ وہاں قدم رکھنے کا تصور بھی نہ کرتے۔ ایک بڑنے سے صاف ستھرے ڈرائنگ روم کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنے بوسیدہ جوتے دروازے کے باہر اتار دیئے۔ سیکریٹری نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جوتے پہن کر چلو۔"

لیکن وہ جیسے ننگے پاؤں کسی معبد میں آگئے۔ قالین ایسا خوب صورت' دبیز اور ملائم تھا کہ چلتے وقت ان کے پاؤں دھنس رہے تھے۔ انہوں نے کبھی ریشم نہیں پہنا تھا مگر ریشم پر چل رہے تھے۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی سامان سے آرائش کی گئی تھی۔ وہ سارا دن وہاں کی ایک ایک چیز کو دیکھ نہ پاتے۔ دیکھتے دیکھتے رات ہو جاتی۔

سیکریٹری نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم ایسے ہی ٹھیک ہیں۔"

سیکریٹری نے کہا۔ "تمہارے بیٹھنے سے صوفے میلے نہیں ہوں گے۔ بیٹھ جاؤ۔"

بوڑھا نیچے قالین پر بیٹھنے لگا۔ بیٹے نے اسے نیچے بیٹھنے سے روک دیا۔ اس کے ذہن میں علم کی روشنی تھی۔ اتنا جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے۔ وہی ایک ایسی ذات پاک ہے جو نیچ بنا کر بھی اونچا بننے کی توفیق دیتا ہے۔

وہاں کے زینے کے پائدانوں پر بھی قالین بچھا ہوا تھا۔ زینے کی بلندی پر بدیع الزماں نے آکر پوچھا۔ "کیا یہی وہ لوگ ہیں؟"

سیکریٹری نے ادب سے کہا۔ "یس سر! اس جوان کا نام فہیم الزماں ہے اور یہ اس کا باپ ہے۔"

بدیع الزماں بڑے شاہانہ انداز میں آہستہ آہستہ ایک ایک پائدان سے اترتے ہوئے بولا۔ "میرے آدمی نے بتایا ہے کہ تم لوگ بہت مجبور ہو اور محتاج ہو۔"

فہیم نے کہا۔ "سر! ہم حالات سے مجبور تو ہیں لیکن محتاج نہیں ہیں۔ محنت سے روزی حاصل کرتے ہیں۔"

بدیع الزماں نے سمجھ لیا کہ وہ جوان خوددار ہے۔ ذرا سنبھل کر الفاظ کا استعمال کرنا ہوگا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا یہ محتاجی نہیں ہے کہ تم محنت کرنے کے باوجود بورڈ کے امتحان میں شاید نہیں بیٹھ سکو گے؟"

فہیم نے کہا۔ "ایسے وقت حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود نہ وظیفہ ملتا ہے اور نہ تعلیمی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مجبوراً تعلیم حاصل کرنے کی لگن سے باز آنا پڑتا ہے۔ اشتہاری پیغام میں پڑھا تھا کہ آپ ذہین طلبہ کو تعلیمی وظیفہ دے کر ان کی مشکل آسان کرنا چاہتے ہیں اور انہیں آگے تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ دینا چاہتے ہیں۔ آپ کی دریا دلی نے مجھے حوصلہ دیا ہے۔ اس لیے آپ کے سامنے حاضر ہوا ہوں۔"

وہ زینے سے اتر کر نیچے آیا اور ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر بولا۔ "میں کسی غریب کے صرف بیٹے کے نہیں' بیٹی کے بھی کام آنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے سیکریٹری کے ذریعے تمہارے گھریلو حالات کا علم ہوا ہے۔ کیا پچیس ہزار روپے بھی تمہاری [illegible] کی

رخصتی ہو جائے گی؟"

"پچیس ہزار؟" دونوں باپ بیٹے نے آنکھیں پھاڑ کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ باپ اکثر سوچتا تھا' کم از کم پانچ ہزار روپے بھی رخصتی کے لیے کہیں سے نہیں مل سکیں گے۔ اللہ کرے راستہ چلتے کہیں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مل جائے۔ دعا مانگنے سے الہ دین کا چراغ نہیں مل جاتا لیکن اس وقت خواب پورا ہو رہا تھا۔ بدیع الزماں چراغ کے جن کی طرح صوفے پر بیٹھ کر انہیں پچیس ہزار روپے دینے کی بات کر رہا تھا۔

بوڑھا تو فوراً ہی اس کے قدموں سے جا کر لپٹ جانا چاہتا تھا مگر بیٹے نے اسے پکڑا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ "آپ واقعی دریا دلی کی مثالیں پیش کر رہے ہیں لیکن کامن سنس سے سمجھا جائے تو یہ دنیا صرف دیتی نہیں' لیتی بھی ہے۔ آپ نے اخبارات میں صرف تعلیمی امداد دینے کی بات کی تھی۔ اب میری بہن کو سہاگن بنا کر اس کی ڈولی اٹھا کر ہمارے سروں سے ایک بہت بڑا پہاڑ اٹھا رہے ہیں۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ کھل کر باتیں کریں۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "دو اجنبی باتیں کرتے کرتے کھلتے جاتے ہیں۔ پہلے آرام سے بیٹھو پھر کھل کر باتیں ہوں گی۔"

نعیم باپ کا بازو تھام کر ایک بڑے صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "پہلے میں یہ بتا دوں کہ تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں پھر تم بتاؤ گے' کیا میرا صرف ایک کام کر سکتے ہو؟"

"آپ ڈھیر ساری مہربانیاں کر رہے ہیں۔ اگر آپ کا کام میرے اختیار میں ہو گا تو میں ضرور کروں گا اور آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"میں تم جیسے ذہین نوجوان سے یہی توقع کرتا ہوں۔ میرا بیٹا بھی بورڈ کا امتحان دینے والا ہے۔ تعلیم کے معاملے میں اس کا ذہن ذرا کمزور ہے۔ یعنی وہ امتحان ضرور پاس کرے گا لیکن اے گریڈ نہیں لا سکے گا اور میں چاہتا ہوں' وہ اے گریڈ میں سب سے زیادہ مارکس حاصل کرے۔"

"جناب! سب سے زیادہ مارکس حاصل کرنے کا انحصار طالب علم کی ذہانت اور

محنت پر ہے۔ دنیا کا کوئی دولت مند اپنی تمام دولت دے کر بھی اپنے بچے کے لیے ذہانت نہیں خرید سکتا۔"

"خرید سکتا ہے۔ اس دنیا میں دولت سے ہر چیز خریدی جا سکتی ہے پھر ذہانت کیوں نہیں خریدی جا سکتی؟ کیا میں تمہاری بہن کی رخصتی کے لیے پچیس ہزار دے کر اور تمہارے تمام تعلیمی اخراجات برداشت کر کے تم سے یہ توقع نہیں کر سکتا کہ تم اپنی ذہانت میرے بیٹے رئیس الزماں کو دے دو۔"

"میں نہیں سمجھا کہ اپنی ذہانت آپ کے صاحب زادے کو کیسے دے سکوں گا۔"

"بڑی آسان سی بات ہے۔ بورڈ کے امتحانات میں تم میرے بیٹے رئیس الزماں کے نام سے بیٹھو گے اور میرے بیٹے بن کر تمام پرچے حل کرو گے۔"

نعیم کچھ پریشان ہو گیا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ "یہ تو تعلیمی شعبے کو دھوکا دینے والی بات ہے اور تعلیم سے مذاق ہے۔ کیا مجھے فراڈ کرنا چاہیے؟"

اس کے حالات نے سمجھایا۔ "ہاں ایسا کرنا چاہیے۔ نہیں کرو گے تو بہن گھر میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائے گی۔ باپ کو وہی سات روپے کی پانی ملی ہوئی دوائیں ملتی رہیں گی اور تم خود تعلیم سے محروم رہو گے۔"

نعیم نے پوچھا۔ "اگر میں آپ کے صاحب زادے کے نام سے امتحان دوں گا تو خود اس سال اپنے نام سے امتحان نہیں دے سکوں گا۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "میں تمہارا تعلیمی سال برباد نہیں ہونے دوں گا۔ تم بھی اسی سال بورڈ کا امتحان دے سکو گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

"ہم لوگ ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔ تم صرف اپنا نام تبدیل کرو گے میں اپنے ذرائع سے تمہارے نئے نام رئیس الزماں سے برتھ سرٹیفکیٹ اور دیگر کاغذات وغیرہ بنوا لوں گا۔ ان میں تمہاری تصویریں ہوں گی لیکن تمہارا نام رئیس الزماں ولد بدیع الزماں ہو گا۔ ویسے تمہارے باپ کا نام کیا ہے؟"

بوڑھے نے کہا۔ "میں غریب ہوں مگر آپ کا ہم نام ہوں۔ میرا نام بھی بدی الجمع

ہے۔"

بدیع الزماں نے ناگواری سے کہا۔ "اپنا نام صحیح طرح لیا کرو۔ جمع نہیں، زماں کہا کرو۔"

نعیم نے کہا۔ "میرے ابا ز، ف، ق، اور غ جیسے حروف صحیح طرح ادا نہیں کر سکتے۔ یہ بچپن سے اسی طرح بولتے آ رہے ہیں۔"

"لیکن مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میرے نام کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ تم خود سوچو، بدی الجمع کے معنی ہوتے ہیں، برائیوں کی جمع۔"

کوئی اپنی ایک برائی کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ جبکہ اس کا نام کہہ رہا تھا کہ وہ برائیوں کا مجموعہ ہے۔ خواہ ریس کے میدان میں فراڈ کیا جائے، سیاست میں بے ایمانی کی جائے یا تعلیم کے شعبے میں گھپلا کیا جائے، بدیع الزماں اپنی کسی برائی کو تسلیم نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ایسی برائیوں کو سیاسی ذہانت اور حکمتِ عملی کا نام دیا جاتا ہے۔

وہ بولا۔ "سنو ہمارے درمیان جو بھی معاملات طے ہونے والے ہیں، اس سے پہلے اپنے باپ کو سمجھا دو کہ یہ میرے سامنے اپنا نام کبھی نہ لے۔"

"میرے ابا نے سمجھ لیا ہے۔ یہ اپنا نام آپ کے سامنے نہیں لیں گے اور میری سمجھ میں یہ بات آ گئی ہے کہ میرا نام تبدیل کر کے رئیس الزماں رکھا جائے گا۔ ولدیت تبدیل نہیں کرنا پڑے گی کیونکہ آپ دونوں ہم نام ہیں۔ آپ آگے سمجھائیں کہ مجھے کرنا کیا ہے؟"

"تم اپنی تصاویر اور بائیو ڈیٹا لے آؤ۔ باقی سارے کام میں کرا دوں گا۔ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہو گا۔ آئندہ ہمیشہ کے لیے تمہارا نام رئیس الزماں رہے گا۔ اسی نام سے تم بورڈ کے امتحانات دو گے اور محنت کر کے سب سے زیادہ مارکس حاصل کرو گے۔ تمہیں جو سب سے اونچے درجے کی سند حاصل ہو گی، تم وہ سند میرے بیٹے کو دو گے اور میرے بیٹے کو بی گریڈ یا سی گریڈ کی سند حاصل ہو گی، وہ سند تم لو گے۔"

"آپ کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں لیکن ہم ایک ہی سال کے اسٹوڈنٹس ہوں گے۔ نام اور ولدیت بھی ایک ہو گی تو کچھ عجیب سی بات نہیں ہو گی؟ کوئی شبہ تو نہیں کرے

گا؟"

"تم دونوں کے اسکول الگ ہوں گے۔ تمہارا داخلہ بہت مہنگے اسکول میں میرے بیٹے کی حیثیت سے ہو گا اور میرے بیٹے کا داخلہ شہر کے کسی بھی سستے انگلش میڈیم اسکول میں ہو جائے گا۔ یہ سب میری درد سر ہے میں اپنے ذرائع سے تمام کام نمٹا لوں گا۔"

نعیم سر جھکا کر سوچنے لگا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "کوئی بات کھٹک رہی ہو تو تم بلا جھجک پوچھ سکتے ہو۔"

وہ بولا۔ "ایک قباحت ہے۔ اونچے درجے سے کامیاب ہونے والوں کو بھی ملازمت نہیں ملتی ہے۔ ہر سال لاکھوں جوان تعلیم سے فارغ ہو کر بے روزگار پھرتے ہیں۔ میری ذہنی اور تعلیمی صلاحیتوں کو بھی کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔"

"نہ کرے۔ تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے ذرائع بہت اوپر تک ہیں۔ میں تمہیں کسی بھی شعبے مین افسر لگوا دوں گا پھر میرے ہاں بھی اتنا زیادہ کام ہے کہ تم بے روزگار نہیں رہو گے۔ گھر جا کر غور کرو۔ میں تمہاری زندگی کے بڑے بڑے مسائل حل کر رہا ہوں اور تمہیں میرا صرف ایک مسئلہ حل کرنا ہے۔"

بوڑھے نے کہا۔ "میں بہت دیر سے کھاموس ہوں مگر یہ جرور کہوں گا کہ آپ پھرستہ ہیں۔ ہمارے سب دکھ درد دور کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یکین دلاتا ہوں۔ میرا بیٹا آپ کا کام جرور کرے گا۔ اپنا پیدائس کا کاگج آپ کے بیٹے کو دے گا۔"

بدیع الزماں نے نعیم سے کہا۔ "کل اپنی تصویریں اور بائیو ڈیٹا لے آؤ۔ ایک ہفتے کے اندر تمام اہم دستاویزات کے ذریعے تم رئیس الزماں بن جاؤ گے۔ ایک ہفتے کے اندر یہ تبدیلی ہوتے ہی میں تمہیں پچیس ہزار روپے تمہاری بہن کی رخصتی کے لیے دوں گا اور تمہیں ماہانہ دو ہزار روپے دوں گا تاکہ تم کہیں محنت مزدوری میں وقت ضائع نہ کرو اور ایسی زبردست اسٹڈی کرو کہ امتحان .... میں زیادہ سے زیادہ مارکس حاصل کر سکو۔ تم جتنی زیادہ محنت کرو گے، اتنا ہی میٹھا پھل میرے بیٹے کو ملے گا۔"

"جناب! کسی وجہ سے مجھے ناکامی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور آپ کی

توقع کے مطابق اونچی پوزیشن حاصل نہ کرسکوں' تب کیا ہوگا؟"

"میں تمہیں بیمار نہیں رہنے دوں گا بلکہ ملک اور ملک سے باہر تمہارا علاج کراؤں گا۔ کوئی ناگہانی رکاوٹ پیش آئے گی تو میں اس سے بھی نمٹ لوں گا۔"

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔ آپ ہر دکھ سے محپھوج رہیں۔ ہم ساری جندگی آپ کو دعائیں دیتے رہیں گے۔"

بدیع الزماں نے فہیم سے کہا۔ "آج سے اپنا پیدائشی نام بھول جاؤ۔ اپنے گھر میں اور رشتے داروں میں یہ اعلان کردو کہ فہیم کے نام میں تمہارے لیے بدنصیبی تھی۔ تم نے اپنی خوش نصیبی کی خاطر اپنا نام رئیس الزماں رکھ لیا ہے۔"

"جناب! رئیس الزماں تو بڑا پیارا نام ہے۔ ہمارے لیے کھوس نصیبی لا رہا ہے۔ ہم گھر کے اندر بھی اسے رئیس کے نام سے پکارا کریں گے۔"

بدیع الزماں نے دو ہزار روپے دیئے پھر کہا۔ "کل اپنا بائیوڈیٹا لے کر آؤ بلکہ خود بھی نہ آؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں میرے رشتے دار یا دوست احباب میں سے کوئی دیکھے اور تمہیں رئیس الزماں کے نام سے پہچانے۔ میرا سیکریٹری تمہارے گھر جایا کرے گا۔ اسی کے ذریعے سارا لین دین ہوتا رہے گا۔"

باپ بیٹے نے اٹھ کر سلام کیا پھر وہاں سے چلتے ہوئے باہر آئے۔ باہر پورچ میں ایک کار آکر رکی۔ رئیس الزماں نے کار سے اتر کر سیکریٹری سے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

سیکریٹری نے کہا۔ "وہی ہیں۔ آپ کے ڈیڈی سے تمام معاملات طے ہو گئے ہیں۔ آج سے اس جوان کا نام رئیس الزماں رکھا گیا ہے۔"

فہیم نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ اس نے کہا۔ "آدمی اپنا نام بدل کر بھی رئیس نہیں بن سکتا۔ تم وہی رہو گے جو پہلے تھے۔ کوا ہنس کی چال چل کر بھی کوا ہی رہتا ہے۔ اپنی اوقات ہمیشہ یاد رکھنا۔"

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلتا ہوا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ فہیم کو اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا دل اور دماغ کہہ رہا تھا کہ اپنی ذہانت اور اپنا علم بیچ کر وہ بہت بڑا نقصان کر رہا ہے اور اس بڑے آدمی کے دو ہزار لوٹا دے لیکن اسی ایک ہفتے میں بہن کو سہاگن بنا

کر رخصت کرنے کے لیے پچیس ہزار روپے ملنے والے تھے۔ باپ کا باقاعدہ علاج ہونے والا تھا۔ گھر کے سارے دلدر دور ہونے والے تھے۔

وہ دماغ پر بوجھ اٹھائے' سر کو جھکائے کوٹھی کے احاطے سے باہر ایک مین روڈ کے فٹ پاتھ پر آیا۔ باپ نے کہا۔ "دو ہجار لے کر جیب میں رکھ لیے۔ جوان بیٹے اپنی کمائی باپ کے ہاتھوں میں دیتے ہیں۔"

اس نے جیب سے رقم نکال کر باپ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ "اللہ تیرے جیسا پھرمابردار بیٹا سب کو دے۔ تجھے بچپن سے پھیم جیسا نام سننے کی عادت ہو گئی ہے۔ اب اس نام پر مٹی ڈال۔ بول اب تیرا کیا نام ہے۔"

اس نے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ خاموش رہا۔ باپ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا اتنی جلدی نام بھول گیا؟ تیرا نام رئیس ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔ میرا نام رئیس الزماں ولد بدی الجمع ہے۔ جب بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں میں کوئی بڑا اور اہم لین دین ہوتا ہے تو برائیاں جمع ہونے لگتی ہیں۔"

باپ نے توجہ نہیں دی۔ وہ نوٹ گن کر جیب میں رکھ رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

اس رات کوئی نہ سو سکا۔ ایسی غیر متوقع خوشی ملی تھی کہ ان کی چاند رات ہو گئی تھی۔ صابرہ نے خوشی سے روتے ہوئے کہا۔ "ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ بڑا آدمی پھیم کو نوکری دینے بلائے گا اور ہماری ناجو کی رُکھستی کے لیے پچیس ہجار روپے دے گا۔"

شوہر نے ڈانٹ کر کہا۔ "پھر پھیم کہہ رہی ہو؟ میں نے ساری باتیں سمجھا کر تاکید کی تھی کہ اب بیٹے کو پھیم نہ کہنا۔ نہ کہنا۔ یہ رئیس ہے۔ رئیس الجمع ہے۔"

"میں کھوسی میں بھول گئی تھی۔ اب نہیں بھولوں گی۔ اللہ میاں کی بھی کیا کدرت ہے۔ نام بدلنے سے نصیب بدل جاتے ہیں۔ سچ پوچھو تو میرے کو یکین نہیں آرہا ہے کہ وہ امیر آدمی ہم کو پچیس ہجار روپے دے گا۔ پچیس ہجار کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ وہ ایسے دے رہا ہے' جیسے پچیس پیسے دے رہا ہو۔"

"اری! جس نے کچھ لیے دیئے بگیر دو ہجار روپے دیئے ہیں وہ پچیس ہجار بھی جرور دے گا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ اسے ہمارے بیٹے کے دماگ کی جرورت ہے۔ وہ اپنے بڑے لوگوں میں اپنے بیٹے کا نام اونچا رکھنے کے لیے ہمارے بیٹے کا دماگ کھرید رہا ہے۔ ہمارا کیا جاتا ہے؟ ہم اپنے بیٹے کی کھوپڑی سے دماگ نکال کر نہیں بیچ رہے ہیں۔ وہ تو امیر جادے کے لیے صرپھ لکھے گا پڑھے گا۔"

نازو دوسرے کمرے میں بستر پر لیٹی سوچ رہی تھی۔ نکاح کے بعد تین برس گزرنے والے تھے۔ وہ مایوس ہوگئی تھی کہ ابا اور بھائی کبھی پانچ ہزار روپے کا انتظام نہیں کر سکیں گے۔ رشتے داروں سے بھی قرض ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اسے دلہن بن کر سسرال جانے کے لیے دس ہزار بہت تھے۔ جبکہ پچیس ہزار مل رہے تھے۔

پہلی بار اس کے اندر سے ناامیدی اور مایوسی ختم ہوئی تھی وہ بھی بہت خوش تھی۔ جاگتی آنکھوں سے اپنے دولہا کو دیکھ رہی تھی اور مسکراتے اور شرماتے ہوئے اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہی تھی۔ وہ ہمیشہ اپنے بھائی پر ناز کرتی تھی اور ماں باپ سے کہا کرتی تھی کہ بھائی بہت ذہین ہے۔ ایک دن بہت بڑا آدمی بنے گا اور اب بڑا آدمی بننے کی ابتدا ہو چکی تھی۔

اس نے بستر پر کروٹ بدل کر ماں کو آواز دی پھر پوچھا۔ "امی! بھائی کہاں ہے؟ کتنی رات ہو چکی ہے۔"

باپ نے کہا۔ "آجائے گا۔ وہ بھی کھوسی کے مارے ایک جگہ نہیں ٹک رہا ہے۔ کھوب گھوم پھر رہا ہو گا۔ میں نے اسے بیس روپے دے دیئے ہیں۔"

وہ آدھی رات کے بعد آیا۔ نازو سو گئی تھی۔ ماں باپ جاگ رہے تھے اور بیٹی کی رخصتی کے لیے اخراجات کا حساب کر رہے تھے۔ باپ نے پوچھا۔ "اتنی رات کو کہاں سے آرہا ہے؟"

وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا پھر بولا۔ "پتا نہیں، میں کہاں چلتا جا رہا تھا۔ مجھے اپنی خبر نہیں تھی۔ یہ بھی پتا نہیں ہے کہ واپس کیسے آیا ہوں؟"

"میں نے تجھ کو بیس روپے دیئے تھے۔ بسوں میں گھوم پھر سکتا تھا۔"

اس نے جیب سے بیس روپے نکال کر باپ کے سامنے پھینک دیئے پھر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ ماں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹے؟ تم بہت ٹوٹے ہوئے سے لگ رہے ہو؟"

"پورا ٹوٹا ہوا گھر جڑ رہا ہو تو کسی ایک کے ٹوٹنے کا حساب نہیں کرنا چاہیے۔"

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صابرہ نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ وہ اپنے سامنے سے بیس روپے اٹھا کر، انہیں گن کر جیب میں رکھ رہا تھا۔ اسے پیسوں کی پڑی تھی۔ ویسے وہ بھی حالات سے مجبور تھا۔ بوڑھا اور بیمار تھا۔ جوان بیٹی کو گھر سے سسرال رخصت کرنے کے لیے جوان بیٹے کا ہی سہارا لے سکتا تھا۔ چونکہ تعلیم کی اہمیت کو نہیں سمجھتا تھا اس لیے یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ بیٹا اعلیٰ ذہانت کا سرٹیفکیٹ فروخت کر رہا ہے اور اس طرح محکمہ تعلیم سے بھی فراڈ کر رہا ہے۔ فی الحال یہ سودے بازی راس آرہی تھی۔ تمام مسائل حل ہو رہے تھے لیکن حالات کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آئندہ اس سے بھی پیچیدہ مسائل پیدا ہو سکتے تھے۔

وہ دوسری صبح ٹھیلا لے کر باہر جانے لگا۔ باپ نے کہا۔ "کہاں جا رہا ہے؟ اب اسے چھوڑ دے۔ ہم سبزیاں بیچ کر جتنا کماتے تھے، اب اس سے زیادہ رقم مل رہی ہے۔"

"ابا! یہ دس بارہ مہینے کی بات ہے۔ ان کے بیٹے کو اے کلاس سند مل جائے گی تو پھر وہ پلٹ کر بھی نہیں پوچھیں گے۔"

"ارے کیا بھول گیا ہے۔ اس بڑے آدمی نے تجھے بہت اچھی ملازمت دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"جب ملازمت ملے گی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال اپنی اوقات کو نہیں بھولنا چاہیے۔ پھر یہ تھوڑی سی سبزیاں رہ گئی ہیں۔ کم از کم انہیں تو بیچ کر پیسے وصول کر لیں۔"

وہ ٹھیلا لے کر گھر سے باہر آگیا۔

☆======☆======☆

اس کے ماموں جان صبح دفتر جایا کرتے تھے اور شام کو کبھی جلدی اور کبھی دیر سے آیا کرتے تھے۔ انہوں نے دس جماعتوں تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی تعلیمی استطاعت

کے مطابق رات کے وقت اپنی بھانجی کرن خورشید کو کسی حد تک پڑھا دیا کرتے تھے لیکن انگریزی اور ریاضی کے کئی اسباق اچھی طرح سمجھا نہیں پاتے تھے۔ اس سبزی والے جوان نے جس انداز میں ایک نظم کی تشریح کی تھی' وہ اس کے دل و دماغ میں نقش ہو گئی تھی۔ اس نے ماموں جان سے کہا تھا۔ "ماموں جان! آج ایک سبزی بیچنے والا لڑکا بڑی اچھی انگریزی بول رہا تھا۔ ایک نظم کے معنی اور مفہوم کو اتنی وضاحت سے سمجھایا کہ میں حیران رہ گئی۔"

ماموں نے کہا۔ "تعجب ہے۔ ایک سبزی بیچنے والا اور وہ بھی ہمارے ملک میں انگریزی بولتا ہے۔ جبکہ ہمارے ملک کے گریجویٹ انگریزی الفاظ کے صحیح ہجے نہیں جانتے ہیں۔"

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہاں یاد آیا۔ یہاں ایک بابا سبزیاں بیچنے آیا کرتا تھا اور ڈینگیں مارتا تھا کہ اس کا بیٹا ہر سال امتحان میں اول آتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ ڈینگیں نہیں مارتا تھا۔ شاید وہ جوان اسی کا بیٹا ہو گا۔"

"وہ کوئی بھی ہو' غیر معمولی طور پر ذہین لگتا ہے۔"

"ہوں۔ میں اس بابا سے ملوں گا۔ اگر وہ اس کا بیٹا ہو گا اور ٹیوشن پڑھانے پر راضی ہو گا تو میں کہوں گا کہ وہ گھر آ کر تمہیں پڑھا دیا کرے۔"

کرن کی ماں نے کہا۔ "بھائی جان! اس مہنگائی میں گھر کے اخراجات پورے نہیں ہو رہے ہیں پھر کرن کے اسکول کی فیس اور کتابوں کا خرچ الگ ہے۔ آج کل کوئی ٹیوشن پڑھانے والا سو دو سو روپے ماہانہ سے کم نہیں لیتا ہے۔"

"ہاں ٹیوشن بھی مہنگی ہو گئی ہے۔ ایک تو میرے پاس کرن کو پڑھانے کا وقت نہیں ہے پھر یہ کہ صحیح پڑھا نہیں پاتا ہوں۔ آج کل کے بچوں کو اتنی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں کہ پڑھانے والے کا سر درد ہونے لگتا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "پڑھانا کیا ضروری ہے۔ نو جماعتیں پڑھ لے' یہی بہت ہے۔"

"ایسا نہ کہو۔ کرن کے ابا زندہ ہوتے تو کیا ہمت ہارتے؟ میرا اس دنیا میں تم دونوں کے سوا کون ہے؟ میری کرن پڑھے گی اور خوب پڑھے گی۔ اگلے سال میری ترقی ہونے

والی ہے۔ میں ہیڈ کلرک بن جاؤں گا۔ بس یہ سال ہمیں کسی طرح گزارنا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "ماموں جان! مجھے ٹیوشن کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اچھے نمبروں سے پاس ہو کر دسویں میں جاؤں گی۔"

اس کا ماموں عبید الرحمان دفتر چلا گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ کتاب کھول کر پڑھنے لگی مگر دل کھڑکی سے باہر لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے اندر کچھ ایسی تبدیلی محسوس کر رہی تھی جو اس عمر میں لڑکیوں کو رومانس کی طرف لے جاتی ہے لیکن وہ رومانس سے زیادہ فہیم کی علمی شخصیت سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ رات کو جب تک جاگتی رہی' اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ زندگی میں ایسا وقت بھی آتا ہے کہ جسے جانتے نہیں' اسی کے بارے میں زیادہ سوچا جاتا ہے۔ وہ جو کچھ سمجھا کر گیا تھا' اسے سمجھتی رہی تھی اور سمجھانے والے کو سوچتی رہی تھی۔

وہ ایک سادے کاغذ پر کچھ سوچ سوچ کر لکھنے لگی۔ وہ محبت نامہ نہیں تھا لیکن جو کچھ وہ لکھ رہی تھی' ان الفاظ اور فقروں کے پیچھے ڈھکی چھپی اپنائیت تھی۔ اسے یقین تھا کہ جو کچھ وہ لکھ رہی ہے' اس کی وہ تحریر دعا کی طرح مقبول ہو گی۔

دور سے ہی آواز سنائی دی۔ "آلو' ٹماٹر' سیم' مٹر لے لو۔ تازہ تازہ سبزیاں ہیں۔ گوبھی اور پالک بھی ہے۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بڑھ کر کھڑکی کے پردے کو ذرا ہٹا کر دیکھا۔ وہ سبزیوں کے ٹھیلے کو دھکیلتا آ رہا تھا۔ ضرورت مند اسے روک کر سبزیاں خرید رہے تھے۔ وہ گاہکوں سے نمٹ کر آگے بڑھتا ہوا' اسی گھر کی سمت آنے والا تھا۔

کرن نے جو لکھا تھا' اس کاغذ کو تہہ کر کے اپنی مٹھی میں دبا لیا۔ وہ آوازیں لگاتا ہوا قریب آ رہا تھا لیکن کوئی نہ کوئی عورت اپنے گھر سے نکل کر اسے روک لیتی۔ پھر کچھ خریدنے کے بعد اسے آگے بڑھنے کا موقع دیتی تھی۔ آخر وہ کھڑکی کے قریب آ گیا۔

اسی.......... وقت اس کی ماں کمرے میں آ گئی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ ماں کچھ کہتی' اس نے پوچھا۔ "امی! پکانے کے لیے کچھ لیں گی؟"

اس نے اتنی اونچی آواز میں ماں سے پوچھا کہ فہیم بھی ادھر متوجہ ہو گیا۔ ایک گورا

گورا سا ہاتھ کھڑکی کی جالی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اس میں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جھجکنے لگا۔ اندازہ ہوا کہ وہ کاغذ کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کچھ بدحواس سا ہو گیا کہ اس کاغذ کو اس کے ہاتھ سے لینا چاہیے یا نہیں؟

ماں نے کمرے میں الماری کھول کر وہاں سے کچھ نکالتے ہوئے کہا۔ "آج تو پکانے کے لیے ہے۔ کل تازہ سبزیاں خرید لیں گے۔"

پھر ماں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا وہی جوان آرہا ہے' جس نے تجھے سبق سمجھایا تھا؟"

کرن کے ہاتھ سے وہ تہہ کیا ہوا کاغذ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "ہاں وہی ہے۔" پھر وہ کھڑکی کے پاس سے پلٹ کر بولی۔ "رہنے دیں۔ کل ہی تازہ سبزیاں خرید لیں گے۔ سبزیاں بیچنے والے تو روز آتے ہیں۔"

ماں نے کھڑکی کے پاس آکر پردہ ہٹا کر دیکھا۔ فہیم نے کھڑکی کے پاس آکر اس کی ماں کو سلام کیا پھر کہا۔ "یہاں کھڑکی کے پاس آپ کا کچھ گر گیا ہے۔"

کرن کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ فہیم نے جھک کر اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو اٹھا کر اپنی مٹھی میں دبا لیا اور پھر سیدھا کھڑا ہو کر دوسری مٹھی کھول کر پانچ روپے کا نوٹ دکھایا اور اسے دیتے ہوئے بولا۔ "آنٹی آپ کا یہ نوٹ گرا ہوا تھا۔"

"بیٹے! ہمارا تو کوئی نوٹ نہیں گرا تھا۔ کرن! تم نے تو نہیں گرایا تھا؟"

"جج..........جی..........میں نے تو نہیں' ماموں جان نے گرایا ہو گا۔"

فہیم نے کہا۔ "جس نے بھی گرایا ہو' یہ آپ کی کھڑکی کے پاس ہے' آپ ہی کا ہے۔"

وہ نوٹ لے کر بولی۔ "اس کے ماموں جان سدا سے غائب دماغ رہنے کے عادی ہیں۔ کبھی اپنی چیزیں ٹھکانے پر نہیں رکھتے ہیں۔ اِدھر اُدھر پھینکتے رہتے ہیں۔ تم بہت ایماندار ہو بیٹے! ورنہ ایک چونّی پر لوگوں کی نیت خراب ہو جاتی ہے۔"

وہ سلام کر کے ٹھیلے کے پاس آیا پھر اسے دھکیلتا ہوا آوازیں لگاتا ہوا جانے لگا۔ اس کی ماں نے کہا۔ "میں تو کہنا بھول ہی گئی۔ کوئی مشکل سبق ہے تو اس سے پوچھ لیا ہوتا۔

لڑکا اچھا ہے' ذہین ہے اور ایماندار بھی ہے۔ یہ نہ ہوتا تو ہمارے پانچ روپے کبھی ہمیں نہ ملتے۔"

فہیم ایک گلی سے گزرتا ہوا دوسری گلی میں آیا۔ وہاں ٹھیلے کو کھڑا کر دیا۔ ایک جگہ چھاؤں میں بیٹھ کر اس تہہ کیے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگا۔ کرن نے لکھا تھا۔

"میں نہیں جانتی' تم کون ہو؟ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے لیے تعلیم ایک پہچان بن گئی ہے۔ تم نے اس Poem کے بارے میں سمجھایا تو سمجھ میں آیا کہ علم کیا ہوتا ہے؟

"کتابوں میں شائع ہونے والے اور زبان سے ادا ہونے والے الفاظ کے صرف معنی نہیں ہوتے' وہ معنویت و مفہوم سے بھرپور ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو اصطلاحات' تشبیہات اور استعاروں اور کنایوں کی نئی ترکیب سے استعمال کیا جائے تو ان الفاظ کے پیچھے بھرپور شعور حاصل کرنے کا ایک گہرا سمندر ہوتا ہے۔

"میرا خیال ہے' مجھے سمجھایا جائے تو میں بہت دور تک سمجھ لیتی ہوں لیکن کوئی سمجھانے والا نہیں ہے اور ہمارے حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں کتابوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ٹیوشن پڑھ سکوں۔ پھر یہ بھی جانتی ہوں کہ ٹیوشن پڑھانے والے بھی پیشہ وارانہ انداز میں وہی پڑھاتے ہیں جو آج کل اسکول کے ماسٹر پڑھاتے ہیں۔ سب کو اپنے پیٹ کی اور آمدنی بڑھانے کی فکر ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کھوٹے سکے رہتے ہیں اور اپنے ملک کے اہم شعبوں میں کرپٹ بن کر رہتے ہیں۔

"میں تمہیں زحمت تو نہیں دوں گی لیکن کوئی مشکل سبق ہو گا تو اسے تم سے سمجھنا چاہوں گی۔ فی الوقت میں نیوٹن کے حرکت کے تیسرے قانون کو کسی حد تک سمجھ کر بھی شاید نہیں سمجھ پا رہی ہوں۔ کیا تم مثالیں دے کر وضاحت سے سمجھا سکتے ہو؟

"کل سے ہمارا اسکول کھلنے والا ہے۔ میں دوپہر ایک بجے جاتی ہوں۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے چھٹی ہوتی ہے۔ سیون اسٹار اسکول کی طالبہ ہوں۔ شام ساڑھے پانچ بجے گیٹ کے باہر انتظار کروں گی۔ مجھے امید ہے' مایوس نہیں کرو گے۔"

اس نے تحریر کے نیچے اپنا نام کرن خورشید لکھا تھا۔ وہ تمام تحریر پڑھنے کے بعد بھی

اس کاغذ کو کھولے بیٹھا رہا۔ اب وہ تحریر اوجھل ہو گئی تھی۔ کاغذ پر کھڑکی کی جالی کے پیچھے وہ جھلک رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

اونچی سوسائٹی کی جوان لڑکیوں اور لڑکوں کو کسی بھی مشغلے میں اس وقت تک مزہ نہیں آتا جب تک کہ جیت اور ہار کی شرطیں نہ لگائی جائیں۔ بیڈ منٹن' ٹینس یا کرکٹ جیسا کھیل ہو یا ہارس رائڈنگ' موٹر سائیکل ریس اور سمندر میں موٹر بوٹ ریس کا مقابلہ ہو۔ ہر مشغلے میں ہزاروں روپے کی شرط لگائی جاتی ہے۔ پھر جیتنے والا اپنی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کے ساتھ ایک ہی رات میں ہزاروں روپے لٹا دیتا ہے۔ جب تک بڑے بڑے نوٹ ہوا نہیں ہوتے' رئیس زادوں کو مزہ ہی نہیں آتا۔

رئیس الزماں اور ایک امیر زادے کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ سب سے زیادہ تیز رفتاری سے موٹر سائیکل دوڑا سکتے ہیں۔ اس بات پر پچیس ہزار روپے کی شرط لگ گئی۔ ریس کے لیے جو دن مقرر ہوا' اس دن رئیس زادیوں اور رئیس زادوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ایسے موقعوں پر ان جوانوں کی الگ الگ پارٹیاں بن جاتی ہیں اور وہ زور زور سے چیخ کر ایک دوسرے کو ہُوٹ کرتے ہیں۔ فقرے کستے ہیں اور طعنے دیتے ہیں۔

رئیس الزماں اور وہ دوسرا امیر زادہ دونوں ہی ضدی اور جان کی بازی لگا کر اپنی ناک اونچی رکھتے تھے۔ سب ہی متجسس تھے کہ ان دونوں میں سے کون بازی جیتے گا؟ چھٹی کا دن تھا۔ کئی جوانوں کے والدین بھی تماشہ دیکھنے چلے آئے تھے۔ کسی بزرگ نے انہیں خطرناک ریسنگ سے منع نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ حادثہ ہو گا تو زیادہ سے زیادہ چوٹیں آئیں گی۔ ان کے پاس ایسی بے حساب دولت تھی کہ وہ اپنے بچوں کو امریکا بھیج کر ان کے ہاتھ پاؤں کی مرمت کروا سکتے تھے۔

پُرزور تالیوں کے ساتھ ریس شروع ہوئی۔ جتنے جوان تھے' وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اپنی پارٹی کے موٹر سائیکل سوار کو حوصلہ دینے لگے۔ اپنے مخالف کی انسلٹ کرنے لگے۔ وہ دونوں بہت ہی خطرناک رفتار سے اپنی اپنی گاڑیاں دوڑا رہے تھے۔ کمزور دل کے بزرگ

ذرا سہم گئے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ "یہ آج کل کے جوان سمجھتے ہیں کہ زندگی دوبارہ مل جاتی ہے اسی لیے ایسے خطرات مول لیتے ہیں۔"

رئیس الزماں کے تمام حمایتی کچھ مایوس ہو رہے تھے کیونکہ وہ تیز رفتاری کے باوجود اپنے مقابل سے پیچھے رہ جاتا تھا۔ کبھی ایسا لگتا کہ رئیس الزماں آگے نکل جائے گا لیکن اس کا مقابل تو جیسے جان ہتھیلی پر رکھ کر آیا تھا۔ جان لیوا تیز رفتاری کے ساتھ اسے پیچھے چھوڑ دیتا تھا اور کبھی اسے پیچھے رکھنے کے لیے موٹر سائیکل کو دائیں بائیں گھماتا رہتا تھا اور رئیس کو آگے بڑھنے سے روکتا رہتا تھا۔

اس کے یہ ہتھکنڈے بتا رہے تھے کہ رئیس پیچھے ہی رہ جائے گا اور اس کا مقابل یہ ریس جیت لے گا لیکن اچانک بازی پلٹ گئی۔ ایک موڑ مڑتے وقت اچانک اس کے مقابل کی گاڑی پھسل گئی اور وہ گاڑی سمیت دور تک پھسلتا ہوا ایسا گرا کہ پھر خود نہ اٹھ سکا۔ اس کے حمایتی دوڑتے ہوئے اس کی طرف گئے۔ اسے زبردست چوٹیں آئی تھیں لیکن وہ قابلِ برداشت تھیں۔ پریشانی کی بات نہیں تھی۔ امریکا کا گرین کارڈ اس کے پاس تھا۔

رئیس الزماں وننگ ٹارگٹ پر پہنچ کر جیت چکا تھا۔ اس کے حمایتی اسے کاندھوں پر اٹھا کر اچھل رہے تھے اور رقص کر رہے تھے۔ دور کھڑے ہوئے کئی مخالفین اور کئی بزرگ والدین رئیس الزماں کو دیکھ رہے تھے اور آپس میں تبصرے کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ "اس کے باپ بدیع الزماں کو صحیح معنوں میں مقدر کا سکندر کہنا چاہیے۔ بیٹا بھی اپنے باپ کی تقدیر لے کر آیا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "ہاں اکثر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ بیٹا بھی باپ کی طرح مشکل سے مشکل بازیاں جیت لیتا ہے۔"

تیسرے نے کہا۔ "جیت مقدر سے ہوتی ہے اور ان باپ بیٹے نے مقدر کو خریدا نہیں ہے۔ یہ بڑے چالباز ہیں۔ ضرور کوئی گھپلا کرتے رہتے ہیں۔"

ایک خاتون نے کہا۔ "انسان خواہ کتنا ہی چال باز ہو' وہ مقدر سے نہیں جیت سکتا۔

یہ جیسی بھی چالیں چلتے ہوں' ایک دن تقدیر انہیں چاروں شانے چت کر دے گی۔"

رئیس الزماں ایک فاتح کی شان سے اپنی کوٹھی میں آیا۔ اس کے والدین ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بدیع الزماں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آگئے صاحب زادے۔ ہم سن چکے ہیں کہ آپ نے ریس جیت لی ہے اور آج رات تو آپ ضرور گھر سے باہر رہیں گے۔"

"یس ڈیڈ! آپ تو جانتے ہیں۔ دوست جشن منائے بغیر مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"یہ تم اس طرح کھیل کود کر اور تماشوں میں وقت گزارتے رہو گے تو تعلیم کا کیا ہو گا؟ تمہارا نام بی گریڈ میں تو آنا چاہیے۔ وہ غریب لڑکا تمہیں اعلیٰ درجے کا سرٹیفکیٹ دے گا۔ تمہیں کم از کم بی گریڈ کا سرٹیفکیٹ تو اسے دینا چاہیے۔"

بیٹے نے کہا۔ "تعجب ہے' آپ کو غریبوں سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ آپ اس کی بہن کی رخصتی کے لیے پچیس ہزار دے رہے ہیں اور اسے ماہانہ دو ہزار دیتے رہیں گے۔ اس کے خاندان میں کبھی کسی نے اتنے روپے نہیں دیکھے ہوں گے۔ اس بناسپتی رئیس الزماں کو میرے قدموں میں بیٹھ کر پڑھنا اور بورڈ کا امتحان دینا چاہیے۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔ تمہیں بھی بورڈ کا امتحان دینا چاہئے۔ تم بی گریڈ حاصل کرو یا سی گریڈ' اسے بھی ایک سرٹیفکیٹ ملنا چاہئے۔"

"میرا خیال ہے' آپ کے سیکریٹری نے اس بناسپتی رئیس الزماں کا نیا فیصلہ نہیں سنایا ہے۔"

"سیکریٹری آج چھٹی پر ہے۔ تم کس نئے فیصلے کی بات کر رہے ہو؟"

"کل رات آپ کے سیکریٹری سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ فہیم میری جگہ امتحان دے گا لیکن یہ نہیں چاہتا کہ میں اس کی جگہ امتحان دوں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟ وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟"

"وہ اس سال میرے نام سے امتحان دے گا اور آئندہ سال اپنے اصل نام فہیم الزماں کے نام سے کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے۔"

"یعنی وہ اپنا یہ سال ضائع کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں وہ آپ کے سیکریٹری سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے اصل نام سے آئندہ سال بہت اونچی پوزیشن حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح اس کا اپنا کیریئر بنے گا۔"

بدیع الزماں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس نے اپنا کیریئر بنانے کے لیے درست فیصلہ کیا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی نقصان ہے کہ اس کا یہ ایک سال ضائع ہو جائے گا۔"

رئیس الزماں نے ماں کے پاس آکر کہا۔ "آپ خاموش ہیں۔ کچھ ناراض لگ رہی ہیں۔ کیا بات ہے؟"

ماں نے کہا۔ "تم اتنے خطرناک کھیل کیوں کھیلتے ہو؟ اگر تم اس لڑکے کی جگہ موٹر سائیکل سے گرتے تو میری جان ہی نکل جاتی۔"

"ممی! آپ کا بیٹا مرد ہے اور مردوں کا کھیل کھیلتا ہے۔ آپ ناحق پریشان ہوتی ہیں۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "بیٹے! تمہاری ماں کو تمہاری جان کی فکر ہے اور مجھے اپنی ناک کی فکر ہے۔ اگر تم ہار جاتے تو سب کے سامنے ناک نیچی ہو جاتی۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈیڈی! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ شرط لگانے سے پہلے جیتنے کے راستے بنا لیتا ہوں۔ میں نے ایسی چال چلی تھی کہ میرے مقابل کو ہارنا ہی ہارنا تھا۔"

"کیا واقعی؟ تم نے کیا چال چلی تھی؟"

"میں یہ جانتا تھا کہ میرا مقابل کس مکینک سے اپنی موٹر سائیکل چیک کراتا ہے۔ وہ مکینک لالچی ہے۔ میں نے اسے پانچ ہزار روپے دیئے اور کام بنا لیا۔ پتا نہیں اس نے کیا کاریگری دکھائی تھی کہ وننگ پوائنٹ تک پہنچنے سے پہلے میرے مقابل کی گاڑی کا کوئی پرزہ ٹوٹ گیا تھا اور اب بے چارہ اسپتال میں ہے۔"

بدیع الزماں نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم اپنے باپ سے کم نہیں ہو۔ واقعی میری طرح ایک کامیاب زندگی گزارو گے۔"

دونوں باپ بیٹے ہنسنے لگے۔ ماں مسکرانے لگی۔ وہ تینوں خوش تھے اور خوش حال زندگی شاید اس لیے گزار رہے تھے کہ انہیں کامیابی و کامرانی چور دروازوں سے ملتی رہتی تھی۔

☆=========☆=========☆

چھٹی کی گھنٹی بجتے ہی طلبہ و طالبات اسکول کے مختلف کمروں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ دربان نے بڑا گیٹ کھول دیا تھا۔ ان اسٹوڈنٹس کو لے جانے والی سوزوکیاں، بسیں اور پرائیویٹ گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں اور لڑکے اپنی اپنی گاڑیوں میں جا کر بیٹھ رہے تھے۔ کرن اسی بھیڑ میں چلتی ہوئی باہر کے آہنی گیٹ سے نکل کر سڑک کے کنارے آ گئی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگی۔

اتنے اسٹوڈنٹس اور اتنی زیادہ گاڑیاں تھیں کہ کوئی کسی کو فوراً تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد نظر آیا۔ سڑک کے اس پار کھڑا ہوا تھا اور اسکول کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ کرن کو دیکھ لینے کے بعد ہچکچا رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ بھیڑ اور گاڑیوں سے کتراتی ہوئی سڑک پار کر کے اس کے پاس آ گئی پھر بولی
"میں تمام دن سوچتی رہی، پتا نہیں تم آؤ گے بھی یا نہیں؟ تم آ گئے۔ میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

وہ ذرا شرماتے ہوئے بولا۔ "اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات ہے۔ علم ایک چراغ ہے اور چراغ سے چراغ جلانا چاہیے۔ اس لیے تمہارا کام کر کے لایا ہوں۔ نیوٹن کا حرکت کا جو تیسرا قانون ہے، اسے تم آسانی سے سمجھ لو گی۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "کیا سڑک کے کنارے سمجھاؤ گے؟"

"ہاں۔ یہ پرابلم ہے کہ کہاں بیٹھ کر سمجھایا جائے؟"

"یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ایک بڑا سا پارک ہے۔ ہم وہاں چلیں گے۔"

وہ دونوں ایک سمت چلنے لگے۔ وہ خاموش تھا اور سر جھکائے چل رہا تھا۔ کرن کو انتظار تھا کہ وہ کچھ بولے گا لیکن وہ پہلی بار کسی لڑکی کے ساتھ چل رہا تھا اور کچھ یوں گھبرا رہا تھا جیسے آس پاس سے گزرنے والے اپنا کام چھوڑ کر صرف ان دونوں کو دیکھ رہے ہیں اور اب انہیں بدنام کرنے والے ہیں۔

کرن نے پوچھا۔ "کیا تم اسی طرح خاموش رہتے ہو؟"

"نن........... نہیں بولتا ہوں۔ جب کوئی مجھ سے بولے تو بولتا ہوں۔"

"یعنی تمہیں چھیڑا جائے تو تم بولتے ہو؟"

"ہاں یہی نیوٹن کا تیسرا قانونِ حرکت ہے۔ جب تک عمل نہیں ہو گا اس کا ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اگر ایک گیند کو لے جا کر دیوار سے لگایا جائے تو وہ زمین پر گر پڑے گی۔ گیند اور دیوار ہماری طرح ایک دوسرے سے قریب ہو کر بھی کوئی عمل اور ردِ عمل پیش نہیں کریں گی لیکن گیند کو دیوار پر مارا جائے تو دیوار ردِ عمل کے طور پر گیند کو ہمارے پاس واپس بھیجے گی۔"

اس نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر اسے کھول کر دکھاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تیسرے قانونِ حرکت کے فارمولے کے ساتھ مثالیں دے کر سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تم سمجھ لو گی۔ بس یہ یاد رکھو F (Action) = - (Reaction) یعنی منفی نشان ظاہر کرتا ہے کہ دونوں فورس برابر، لیکن مخالف سمت میں ہیں گیند کا فورس دیوار کی طرف گیا۔ دیوار کے فورس نے بھی اسے مخالف سمت پھینک دیا۔"

وہ ایک پارک میں داخل ہو گئے۔ فہیم نے کہا۔ "ابھی ہم چل رہے ہیں۔ زمین پر اپنے قدموں سے دباؤ ڈال رہے ہیں اور زمین ردِ عمل کے طور پر ہمارے پیروں کو اٹھا رہی ہے۔ تم ذرا رک جاؤ۔"

وہ رک گئی۔ وہ بھی ٹھہر گیا پھر بولا۔ "ہم کھڑے ہیں۔ زمین پر کوئی عمل نہیں کر رہے ہیں۔ اس لیے زمین بھی ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کوئی ردِ عمل پیش نہیں کر رہی ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "بائی گاڈ! تم نے نیوٹن کا تیسرا قانونِ حرکت کتنی آسانی سے سمجھا دیا ہے۔"

وہ اسے کاغذ دیتے ہوئے بولا۔ "اس میں کچھ اور تفصیلات لکھی ہوئی ہیں۔ گھر جا کر اسے پڑھو گی تو اور وضاحت سے سمجھ میں آئے گا۔"

کرن نے اس سے کاغذ لے کر اسے تہہ کر کے بیگ میں رکھا۔ فہیم نے پوچھا۔

"اب چلیں؟"

وہ چونک کر بولی۔ "کہاں؟"

"گھر اور کہاں؟ تم جو سمجھنا چاہتی تھیں' وہ میں نے سمجھا دیا ہے۔"

وہ الجھ سی گئی۔ کرن سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ بالکل ہی اناڑی ہو گا۔ علم ریاضی کے مطابق صرف دو اور دو چار جانتا ہو گا۔ یہ نہیں سمجھتا ہو گا کہ جب دو مل کر ایک ہو جائیں' تُو تُو نہ رہے' مَیں مَیں نہ رہوں تو علم ریاضی' محبت کی فیاضی میں بدل جاتی ہے۔ ایک اور ایک دو.......... اور دو اور دو چار کا حساب غلط ہو جاتا ہے۔

فہیم کو سمجھنا چاہیے تھا کہ دو نوجوان ہرے بھرے پارک میں صرف پڑھنے نہیں کچھ اور بھی سمجھنے اور سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔ اس نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

وہ جل کر بولی۔ "تمہاری ٹیوشن فیس کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"میں نے تو فیس نہیں مانگی اور نہ مانگوں گا۔"

"تم لکھنے پڑھنے کے سوا کوئی بات نہیں کرتے ہو؟"

"ہاں سبزی منڈی کے بارے میں بہت کچھ بول سکتا ہوں لیکن تمہیں ان باتوں سے کہاں دلچسپی ہو گی۔ تمہیں.......... شاعری سے دلچسپی ہے؟"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "ہاں۔ کوئی خوب صورت سا شعر سناؤ۔"

اس نے کچھ سوچا پھر کہا۔ "ہاں ایک شعر یاد آیا ہے۔"

پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "عرض کیا ہے۔

"مرنے سے پہلے مر گئے تھے

جینے سے کچھ ایسے ڈر گئے تھے"

کرن نے پوچھا۔ "یعنی مُردہ اپنی قبر سے مرنے کی وجہ سے بتا رہا ہے کہ وہ جینے سے ڈر گیا تھا؟ مجھے دیکھ کر تمہیں یہی شعر یاد آیا ہے؟"

"سمجھنے کی کوشش کرو۔ اس شعر میں ایک کیفیت ہے۔"

"کیا تم کسی کے دل کی کیفیات سمجھتے ہو؟"

"علم نفسیات کے اسٹوڈنٹس چہرے' دماغ اور دلوں کی کیفیات کی خوب اسٹڈی کرتے ہیں تب انہیں کسی کی دلی کیفیات کا علم ہوتا ہے۔ علم کے الگ الگ شعبے ہوتے ہیں۔"

"تم صرف علم کے حوالوں سے بات کرتے ہو۔ کیا ہماری عمر میں علم کے سوا دوسری باتیں نہیں ہوتیں؟"

"کیا تم کسی سے مل کر اپنا تعارف نہیں کراتے ہو۔ تم نے اب تک مجھے اپنا نام نہیں بتایا ہے۔"

وہ نام کی بات پر الجھ گیا۔ کون سا نام بتائے؟ فہیم الزماں یا رئیس الزماں؟ اس دولت مند فرشتے بدیع الزماں نے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ فہیم کو بھول جائے۔ اسے آئندہ ہمیشہ رئیس الزماں کے نام سے زندگی گزارنا ہے۔ گھر کے اندر اس کے پیدا کرنے والے ماں باپ بھی رئیس الزماں کہہ کر مخاطب کیا کریں۔ اس کے رشتے داروں اور احباب و اقارب کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اپنا نصیب بدلنے کے لیے نام تبدیل کیا ہے۔ اب سب ہی اسے رئیس کے نام سے مخاطب کیا کریں گے۔

کرن نے کہا۔ "خاموش کیوں ہو گئے ہو؟ ایسا لگتا ہے' اپنا نام بھول گئے ہو؟"

وہ جبراً مسکراتا ہوا بولا۔ "بھلا کوئی اپنا نام بھولتا ہے؟ میں سوچ رہا تھا کہ اپنا کون سا نام بتاؤں؟"

"تعجب ہے۔ کیا تمہارے کئی نام ہیں؟"

"نہیں۔ صرف دو نام ہیں۔ پیدائش کے وقت میرا نام فہیم الزماں رکھا گیا تھا لیکن ابا کو رئیس الزماں جیسا نام پسند ہے۔ ہم غریب ہیں۔ ابا امیر بننے کے خواب دیکھتے ہیں اسی لیے انہوں نے میرا نام رئیس الزماں رکھا ہے۔ میں اپنی دنیا کے کثیف اور غلیظ ماحول کا رئیس ہوں۔ یہی میرا تعارف ہے۔"

"تم اچانک افسردہ ہو گئے ہو۔ رئیس نام بھی اچھا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت رئیس اعظم بن جاؤ۔"

اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کرن نے اونچا خواب دکھانے والی بات کی تھی۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ تمہارا زیادہ وقت پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتا ہو گا۔ میں تمہیں زیادہ دیر رکنے کو نہیں کہوں گی لیکن کچھ وقت نکال کر مجھ سے مل سکتے ہو؟ میں

تمہاری مدد سے خوب محنت کر کے اے گریڈ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"انشاء اللہ تم اے گریڈ میں سب سے زیادہ مارکس حاصل کرو گی۔ میں کل بھی آؤں گا۔ روز آیا کروں گا۔ کوئی مجبوری ہوگئی تو شاید اس دن نہ آسکوں۔"

"کیا آج کوئی مجبوری ہے' تم کئی بار یہاں سے چلنے کی بات کر چکے ہو۔"

"وہ بات یہ ہے کہ یہ تفریحی پارک ہے۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ کسی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھا تو تم بدنام ہو جاؤ گی۔"

"اس ایک کروڑ کی آبادی والے شہر میں کتنی ہی عورتیں مردوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں' مختلف تفریح گاہوں میں دکھائی دیتی ہیں' کیا ان سے کوئی پوچھتا ہے کہ ان کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ کیا انہیں کسی طرح بدنام کیا جاتا ہے؟ دراصل ہمارے اندر چور ہے جو دنیا والوں سے ڈرتا ہے۔"

فہیم نے دل میں تسلیم کیا کہ اس کے اندر چور ہے۔ وہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اتنی اچھی لگتی ہے کہ دنیا والوں کو معلوم نہ ہو جائے۔ پتا نہیں لوگ کیسی کیسی باتیں بنائیں گے اور جب باتیں بنائی جائیں گی تو ایک مرد کا کچھ نہیں بگڑے گا' عورت بدنام ہوگی۔ وہ اسے بدنام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پہلی ملاقات سے اسے اپنی عزت سمجھ رہا تھا۔ اپنی عزت پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہتا تھا۔

وہ پارک کی ایک بینچ پر اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے بولا۔ "تم نے درست کہا' میرے اندر چور ہے۔ میں اپنی ذات سے زیادہ تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ انسان اپنی سب سے زیادہ عزیز چیز پر آنچ نہیں آنے دیتا۔ میں بھی ڈرتا ہوں' تم کہیں بدنام نہ ہو جاؤ۔"

"میں بھی صاف کہہ دوں کہ اپنی ذات سے زیادہ تمہارے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔ کبھی تمہارے نام کے ساتھ بدنامی ملے گی تو وہ بھی میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہوگی۔"

دونوں نے نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر کرن کی پلکیں آپ ہی آپ یوں جھک گئیں جیسے سجدہ کر رہی ہوں۔ اس نے آنچل کو سنبھالتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا...... پہلے اس کا دل اکیلے دھڑکتا تھا۔ اب دھڑکنوں کا میلہ لگ رہا تھا۔

اس دن سے یہ دنیا ان دونوں کے لیے رنگین اور سنگین بن گئی۔ رنگین اس لیے کہ ان کے پیار میں اعتماد اور استحکام پیدا ہو رہا تھا اور سنگین اس لیے کہ انہیں آئندہ نسلوں تک اپنے پیار اور اعتماد کو بحال رکھنے کے لیے دنیاوی چیلنج کا سامنا بھی کرنا تھا۔

☆=========☆=========☆

بدیع الزماں نے رئیس الزماں کے نام سے فہیم کے تمام کاغذات بنوا لیے تھے۔ یہ فیصلہ واضح طور پر ہوگیا تھا کہ فہیم اس بار بورڈ کا امتحان نہیں دے گا۔ اپنا ایک سال ضائع کرے گا لیکن آئندہ سال فہیم الزماں کے نام سے اونچی پوزیشن حاصل کرے گا۔ رزق حاصل کرنے' بہنوں اور بیٹیوں کی ڈولیاں اٹھانے کے لیے اس طرح بھی بڑی بڑی رقومات حاصل کی جاتی ہیں۔ یہ سبق زندگی کے حالات سکھاتے ہیں۔

زندگی کے پیچیدہ مسائل حل کرنے کے لیے کئی ناجائز طریقے اور غلط راستے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا کرنے سے فہیم کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی بہن نازو کو عزت و آبرو کے ساتھ اس کے سسرال رخصت کر دیا اور اس کے باپ کی فکر' پریشانیاں اور بیماریاں بھی دور ہوگئی تھیں۔

یوں دیکھا جائے تو وہ فائدے میں تھے لیکن دین میں اور دنیاوی تہذیب میں ناجائز طریقوں سے ضروریات پوری کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن جب غلط راستوں پر چل کر دولت' عیش و عشرت یا محض ایک پُرسکون زندگی حاصل ہونے لگتی ہے تو یہ یاد نہیں رہتا کہ اللہ اور رسول ؐ نے فلاح کی کون سی راہیں بتائی ہیں۔ یہ اس وقت تک یاد نہیں آتا جب تک کہ غلط عمل کا غلط ردِعمل سامنے نہیں آتا۔ اسی زندگی میں منافع بخش غلطیوں کی سزائیں ملنے لگتی ہیں' ویسے آدمی یہی سوچتا ہے کہ جب سزائیں ملیں گی تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

فی الحال فہیم کی دو اہم مصروفیات تھیں۔ ایک تو وہ روزانہ کرن سے ملاقات کرتا تھا اور بڑی محبت سے پڑھاتا تھا۔ دوسری مصروفیت یہ تھی کہ وہ دن رات رئیس الزماں کی طرف سے امتحان دینے کے لیے پڑھتا رہتا تھا۔ بڑے لوگ ہزاروں روپے ماہانہ ٹیوشن دے کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ بدیع الزماں صرف دو ہزار روپے ماہوار فہیم کو دے رہا

تھا اور بورڈ کے امتحانات کا نتیجہ نکلنے کے بعد وہ اعلیٰ درجے کا سرٹیفکیٹ اپنے بیٹے رئیس الزماں کے نام سے حاصل کرنے والا تھا۔

اس نے فہیم کی بہن کے لیے بیس ہزار اور اس کے لیے ماہانہ دو ہزار دے کر گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا کیونکہ فہیم امتحانات میں سب سے اونچی پوزیشن حاصل کرتا تو بدیع الزماں شرط کے مطابق اپنے دولت مند ساتھیوں سے پانچ لاکھ روپے جیت لیتا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ریس کے گھوڑے پر دو ہزار لگائے تھے۔

وہ اپنے سیکریٹری سے معلوم کرتا رہتا تھا کہ جن دولت مند ساتھیوں نے ایک ایک لاکھ روپے کی شرط لگائی ہے' ان کی بیٹی اور بیٹے کس طرح ریس جیتنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ سیکریٹری نے کہا۔ "جہاں تک میں نے معلومات حاصل کی ہیں' ان کے بچے بہت زیادہ زور لگائیں گے تو شاید بی گریڈ حاصل کر سکیں گے لیکن میں نے دیکھا ہے کہ وہ لڑکیاں اور لڑکے بھی آپ کے صاحب زادے کی طرح سیر و تفریح اور مختلف مشاغل میں وقت گزارتے رہتے ہیں۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بچوں کے والدین بھی پانچ لاکھ جیتنے اور اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے اپنے طور پر چالیں چل رہے ہیں۔ تم ایسا کرو کہ اپنے چند جاسوس ان کے پیچھے لگاؤ اور معلوم کرو کہ وہ کیسے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔"

سیکریٹری نے کہا۔ "آپ اپنے ایک دوست سرفراز خان کے بارے میں تو جانتے ہوں گے۔ ان کے بھائی محکمۂ تعلیم میں ایک بہت بڑے عہدے پر ہیں۔ سرفراز خان صاحب نے اپنے بھائی کے بھروسے پر ہی اپنی بیٹی پر ایک لاکھ روپے کی شرط لگائی ہے اور انہیں یقین ہے کہ وہ پانچ لاکھ روپے جیت لیں گے۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "ہوں' سرفراز خان ہیرا پھیری کر سکتا ہے۔"

سیکریٹری نے کہا۔ "مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد جس نے میئر کی جگہ شہر کے انتظامات سنبھالے ہیں' وہ مرزا امیر الدین کا بچپن کا لنگوٹیا یار ہے۔ دونوں میں آج بھی گہری دوستی ہے اسی لیے مرزا امیر الدین نے بھی اپنے بیٹے پر ایک لاکھ روپے لگائے

ہیں۔ بورڈ کی حل کردہ کاپیاں چیکنگ کے لیے جن پروفیسروں کے پاس بھی جائیں گی' مرزا اپنے دوست کے ذریعے اپنے بیٹے کی کاپیوں کے نمبر بڑھوا دے گا۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ میرے مقابلے پر آنے والے سب ہی رئیس دوست بڑے بڑے ذرائع کے مالک ہیں۔ وہ بازی جیتنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے' میں ناکام رہوں اسی لیے اس غریب لڑکے پر کم سے کم رقم لگا رہا ہوں۔"

☆=========☆=========☆

فہیم رات کی تنہائی میں پڑھتے لکھتے وقت سوچ میں پڑ جاتا کہ وہ دل و جان سے چاہنے والی کرن کو اپنے نام کے سلسلے میں دھوکا دے رہا ہے۔ وہ اسے رئیس کہہ کر مخاطب کرتی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کہ اس محبت کرنے والی کی زبان پر اس کا پیدائشی اور اصلی نام ہو۔ وہ اسے رئیس کے بجائے فہیم کہہ کر مخاطب کرے۔

صرف ایک نام کی وجہ سے ان کی سچی محبت میں کھوٹ پیدا ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس نے کسی حد تک کرن سے اتنا سچ کہا تھا کہ فہیم اس کا پیدائشی نام تھا۔ جبکہ تھا اور ہے میں اتنا فرق ہے کہ سچ' جھوٹ میں بدل جاتا ہے۔ ایک محبت کرنے والی اس کے موجودہ نام رئیس سے ہی محبت کر رہی تھی اور اسی نام سے خود کو وابستہ کر کے فخر کر رہی تھی۔

سچ کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن وہ اپنے جھوٹ اور فراڈ سے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا۔ ایک بہت بڑا جرم یہ تھا کہ وہ محکمۂ تعلیم سے فریب کر رہا تھا۔ دوسری بات یہ کہ کوئی اپنے گھر کی کمزوریاں باہر بیان نہیں کرتا۔ کرن اس کی محبت تھی مگر وہ گھر والی نہیں تھی۔ جب دلہن بن کر آتی تو اس کے گھر کو اپنا گھر سمجھ کر وہاں کے جھوٹ سچ اور اچھائی و برائی کو قبول کر لیتی۔ ابھی معلوم نہیں تھا کہ محبت کا سلسلہ شادی تک پہنچے گا یا نہیں؟ جب شادی ہو گی تو وہ کرن کو حقیقت بتا دے گا۔ عورت محبوبہ بن کر ٹوٹ سکتی ہے۔ بیوی بن کر چھوٹ نہیں سکتی۔ کرن شریکِ حیات بن کر اس کی مجبوریوں کو سمجھ سکتی تھی۔

وہ ایسی ہی الجھنوں میں رہ کر امتحانات کی تیاری کر رہا تھا۔ ایک بہت بڑا فرض ادا کر

رہا تھا۔ ایک ملازم کو ہر حال میں اپنا فرض ادا کرنا پڑتا ہے اور وہ ماہانہ دو ہزار روپے کی ملازمت کر رہا تھا۔ آخر امتحانات شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ جب تک امتحانات جاری رہے، فہیم کرن سے دور رہا۔ اس نے کرن سے کہہ دیا تھا کہ شاید امتحانات کے باعث وہ روزانہ اس سے ملاقات نہ کر سکے۔ جس دن امتحانات کے درمیان گیپ ہو گا، اسی شام پارک میں آکر وہ اس سے ملاقات کرے گا۔

لیکن وہ کسی بھی دن نہیں آیا۔ کرن انتظار کرتی رہی اور پریشان ہوتی رہی۔ اس کے گھر کا پتا معلوم ہوتا تو اس کی خیریت پوچھنے کے بہانے ملاقات کرنے ضرور جاتی۔

وہ جان بوجھ کر اس سے کتراتا رہا۔ جس دن آخری پرچہ حل کیا، اسی شام پارک میں آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "کہاں رہ گئے تھے؟ میں روز یہاں آتی تھی۔ تم نے یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ امتحانات کے دوران میں کب اور کتنے دنوں تک وقفہ رہا کرے گا۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "میں بہت بیمار تھا۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "بیمار تھے؟"

"کیا میرے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے؟"

"بہت تھکے ہوئے سے لگ رہے ہو۔ کچھ مرجھا سے گئے ہو۔ پرچے تو ٹھیک دیئے ہیں نا؟"

"بیماری میں پرچے کیسے دیتا۔ صرف پہلا پرچہ دیا، دوسرے دن سے بیمار پڑ گیا۔ اس کے بعد پھر امتحان ہال میں قدم نہ رکھ سکا۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "اوہ خدایا! تمہارا ایک سال ضائع ہو گیا؟"

اس نے اپنی محبوبہ سے یہ دوسرا جھوٹ بولا تھا۔ جھوٹ ہوتا ہی ایسا ہے۔ دھیرے دھیرے کینسر کی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہو گیا تھا تمہیں؟"

"ٹائی فائیڈ ہو گیا تھا۔ ایسا بخار ایک دو دن میں نہیں جاتا۔ ایک ہفتے تک بستر سے لگا رہا پھر ذرا طبیعت سنبھلی تو گھر والوں نے نکلنے نہیں دیا۔ اچھا کھلاتے پلاتے اور جان بناتے رہے۔ جان بنی ہے تو آج یہاں تک آیا ہوں۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ تم تندرست ہو گئے لیکن مجھے ایک سال ضائع ہونے کا بہت دکھ

ہو رہا ہے۔"

"کیا کیا جائے۔ ہم مصائب سے لڑ سکتے ہیں، تقدیر سے نہیں لڑ سکتے۔ چلو کوئی بات نہیں، تم امتحانات پاس کر کے دسویں میں آؤ گی۔ میں بھی دسویں میں رہوں گا۔ ہم ایک ہی سال بورڈ کے امتحان دیں گے۔"

وہ صدمے سے سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ فہیم نے اسے چور نظروں سے دیکھا۔ دوسری بار اس نے اپنی جانِ حیات سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے دھوکا دے رہا تھا۔ وہ اس کی تعلیمی صلاحیتوں پر ناز کرتی تھی۔ اس لیے صدمے سے دوچار ہو رہی تھی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اسے ابھی ساری حقیقت بتا دے۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت جان کر اس سے ناراض ہو جائے لیکن محبت سے جو صدمہ پہنچ رہا ہے، وہ تو نہیں پہنچے گا اور محبت صدمہ پہنچانے کے لیے تو نہیں ہوتی ہے۔

وہ تھوڑی دیر کشمکش میں رہا پھر اس کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ سچ کہہ دے۔ سچ بہت زہریلا ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر طرح کے مال کو فروخت کرنے والے دلال ہوتے ہیں لیکن وہ پہلی بار تعلیم کو بیچنے والے دلال کو دیکھے گی تو شرم سے زمین پر گڑ جائے گی۔

وہ حق گوئی کا حوصلہ نہ کر سکا۔

☆=========☆=========☆

بدیع الزماں فون پر کسی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ایک ملازم اس کے سامنے آکر ادب سے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گفتگو کرنے کے بعد ریسیور رکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"صاحب! باہر ایک غریب سا لڑکا آیا ہے۔ اپنا نام رئیس الزماں بتاتا ہے۔ یہ تو ہمارے چھوٹے صاحب کا نام ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کیا میرے بیٹے کا نام کسی اور کا نام نہیں ہو سکتا؟ جاؤ اسے اندر لے آؤ۔"

ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد فہیم کے ساتھ واپس آیا۔ بدیع الزماں نے ملازم کو باہر جانے کا حکم دیا پھر اس کے جانے کے بعد کہا۔ "میں نے تم سے کہا تھا کہ یہاں کبھی نہیں آؤ گے۔ مجھ سے براہِ راست رابطہ نہیں رکھو گے۔ ہر بات سیکریٹری کے ذریعے ہو گی۔"

فہیم نے کہا۔ "اب تو ساری باتیں ختم ہو چکی ہیں۔ میں امتحانات سے فارغ ہو چکا تھا۔ میری محنت کا نتیجہ کیا نکلے گا' یہ اللہ جانتا ہے۔ ویسے میرا کام ختم ہو چکا ہے۔ میرے پاس رئیس الزماں کے نام سے جو ضروری کاغذات اور شناختی کارڈ ہیں' وہ تمام چیزیں واپس کرنے آیا ہوں۔ اب میری ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی آئندہ مجھے دو ہزار روپے ملا کریں گے۔"

اس نے شناختی کارڈ اور کاغذات سامنے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیئے۔ بدیع الزماں نے ان کاغذات کو دور سے دیکھا پھر پوچھا۔

"آئندہ سال بورڈ کا امتحان اپنے اصل نام سے دو گے؟ یعنی فہیم الزماں کے نام سے؟"

"جی ہاں۔ میں دوسری بار بورڈ کا امتحان دوں گا۔"

"کیا پہلے کی طرح سبزیاں بیچ کر گزارہ کرو گے؟"

"بے روزگاری لاکھوں جوانوں کا مسئلہ ہے۔ مجھے کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔"

"سوچا جائے تو ایک طرح سے تم ہماری ملازمت کر رہے تھے۔ جب ملازم کی ضرورت نہیں ہوتی تو اسے فارغ کر دیا جاتا ہے۔ تمہارے ساتھ بھی یہی ہونا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں تم سے کہتا کہ تمہاری ضرورت نہیں رہی' تم خود ہی ملازمت چھوڑنے چلے آئے۔ بے شک بہت سمجھ دار ہو۔"

"آپ کی تعریف کا شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیں۔"

وہ سلام کر کے جانے لگا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "ٹھہرو۔ میں نے ابھی جانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ تم نے اپنا فرض ادا کیا ہے لیکن امتحانات کے نتائج کا اعلان نہیں ہوا ہے۔ پتا نہیں دوسروں کے مقابلے میں میرے بیٹے کی پوزیشن کیا آئے۔"

"انسان محنت کرتا ہے۔ پھل اللہ کی رضا سے ملتا ہے۔"

"میں مانتا ہوں اور ابھی تمہیں فارغ نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ تم دوسرے تعلیم یافتہ جوانوں کی طرح بے روزگار نہیں رہو گے۔ میرے دفتر میں تمہارے لیے گنجائش نکل آئے گی۔ امتحانات کے نتائج سامنے آنے تک وہاں کام کرو۔ تمہیں

بدستور ماہانہ دو ہزار ملتے رہیں گے۔ کیا میری آفر سبزیاں فروخت کرنے سے بہتر نہیں ہے؟"

"جی بہتر ہے لیکن پہلا کام مکمل ہو چکا ہے۔ اس لیے اب میں اپنے اصل نام سے ملازمت کروں گا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "ہوں' نام ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ میں یہ نہیں چاہوں گا کہ تم میرے دفتر میں رئیس الزماں ولد بدیع الزماں کہلاؤ اور یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ وہاں اپنے پیدائشی نام سے پکارے جاؤ۔"

"میرے فہیم الزماں کہلانے سے آپ کو کیا نقصان ہو گا؟"

"اگر تم میرے بیٹے کے نام سے امتحانات میں سب سے اعلیٰ پوزیشن حاصل کرو گے تو آئندہ بھی میرے بیٹے کے ہی نام سے کالج میں داخلہ لو گے۔ میں چاہتا ہوں' میرے بیٹے کے پاس زیادہ سے زیادہ تعلیمی قابلیت کی اسناد رہیں۔"

فہیم نے پوچھا۔ "پھر میرے پاس کیا رہے گا؟ کیا میں اگلے سال بھی بورڈ کا امتحان نہیں دے سکوں گا؟ کیا میرے پاس ایک بھی تعلیمی قابلیت کا سرٹیفکیٹ نہیں رہے گا؟"

"میرے بیٹے کے لیے کالج میں پڑھو گے تو ماہانہ چار ہزار روپے دوں گا۔ انٹر سے آگے پڑھو گے تو چھ ہزار روپے۔ ایم اے کے پہلے سال میں پہنچو گے تو ماہانہ دس ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ تمہارے لیے رہائش اور آمدورفت کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔"

"اس میں شبہ نہیں ہے کہ آپ مجھے مالی مشکلات سے دور رکھیں گے تاکہ میں آپ کے صاحب زادے کے لیے امتحانات میں اونچی پوزیشن حاصل کرتا رہوں لیکن یہ تعلیمی سلسلہ تمام عمر نہیں رہے گا۔ یہ ختم ہو گا تو میری ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ مجھے فارغ کر دیں گے یا اپنے دفتر میں کلرک یا ہیڈ کلرک لگا دیں گے اور کسی ہیڈ کلرک کو ماہانہ دس ہزار روپے اور دیگر سہولتیں نہیں ملتیں۔"

بدیع الزماں نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "تم بہت دور تک سوچتے اور بہت اونچا بولنے لگے ہو۔ پہلے آئے تھے تو مسائل کے بوجھ تلے دبے ہوئے

تھے۔ "جی ہاں" سے زیادہ بولنا نہیں جانتے تھے۔ ایک کنواری بیٹی یا بہن کا بوجھ سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ وہ بوجھ میں نے اتار دیا ہے۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ بڑے لوگوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ بڑوں کے درمیان چھوٹے اور کمتر ہونا نہیں چاہتے۔ حالات نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ کے صاحب زادے میرے کاندھوں پر چڑھ کر سب سے اونچا ہو سکتے ہیں۔ اس لیے آپ نے مجھ پر اور میری بہن پر ہزاروں روپے خرچ کیے۔ خود غرضی کے بغیر لین دین نہیں ہوتا۔ آپ نے میری ضرورت پوری کی' میں نے آپ کی ضرورت پوری کر دی ہے۔ میرا خیال ہے' آپ نتائج......... کا انتظار کریں۔ اگر آپ کو میری ذات سے فائدہ پہنچے گا اور آپ جو چاہتے ہیں' وہی نتیجہ آپ کو ملے گا تو پھر دوسرا کوئی سودا ہمارے درمیان ہو گا۔"

بدیع الزماں نے کچھ سوچا۔ ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "تم بہت دیر سے کھڑے ہوئے ہو۔ سامنے بیٹھ جاؤ۔"

وہ سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "اصل مسئلہ نام کا ہے۔ میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی پہلی ملاقات میں کہا تھا کہ تمہارا نام رئیس الزماں تاحیات رہے گا اور اسی لیے یہ شناختی کارڈ اور اہم کاغذات بنوائے گئے تھے۔ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ آئندہ کالج اور یونیورسٹی میں میرے بیٹے کے نام سے تم ہی امتحانات دیا کرو گے اور اس کے لیے ہمیشہ اونچی پوزیشن حاصل کرتے رہو گے۔ دو کشتیوں پر کھڑے رہ کر سفر نہیں کیا جا سکتا۔ سفر کرنے والا ضرور ڈوبتا ہے۔ اسی طرح دو نام تمہیں ضرور ڈبوئیں گے اور ہمارے لیے بھی مسائل پیدا کریں گے۔"

"مجھے اپنے اصلی نام فہیم الزماں کے ذریعے اپنا کیریئر بنانا ہے۔ میں تاحیات آپ پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ ضرورت پوری ہونے کے بعد آپ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ بات صاف ہونی چاہیے۔"

"تم چاہو تو بڑی راز داری سے اپنا کیریئر بنا سکتے ہو۔ اگر میں ماہانہ رقم بڑھا دوں تو تم دہری محنت کر سکتے ہو۔ اپنے نام سے بورڈ کے امتحانات دینے کے علاوہ میرے بیٹے کے لیے بھی انٹر کی کتابیں پڑھ کر اس کے نام سے پرچے حل کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ

جتنے برسوں تک میں تمہارے ماہانہ اخراجات پورے کرتا رہوں' اس وقت تک تم فہیم الزماں کے نام سے خفیہ طور پر اپنی قابلیت سے تعلیمی اسناد حاصل کرتے رہو لیکن فہیم الزماں کے نام سے خود کو ظاہر نہ کرو۔ جب تک میں راز داری کی قیمت ادا کرتا رہوں گا' تم رئیس الزماں ہی رہو گے۔"

"یہ مجھے منظور ہے۔ میں اپنے نام سے اپنا کیریئر بناؤں گا۔ آپ اعتراض نہیں کریں گے تو میں آپ کے لیے کام کرتا رہوں گا۔"

"یہ شناختی کارڈ اور کاغذات یہاں سے اٹھاؤ اور اپنے پاس حفاظت سے رکھو۔ ان سے تمہیں روزی حاصل ہوتی رہے گی۔ امتحانات کے نتائج کا اعلان ہونے تک تمہیں دو ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ اس کے بعد نئے معاملات طے پائیں گے۔"

فہیم وہ شناختی کارڈ اور کاغذات لے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس نے سوچا تھا کہ آج شام کرن سے ملاقات کر کے اسے اصل روداد سنائے گا کہ اس نے کن حالات میں اپنی بہن کو سہاگن بنایا اور کیوں اس نے اپنا ایک سال ضائع کیا ہے؟

یہ انکشاف اس لیے کرنا چاہتا تھا کہ رئیس الزماں کی طرف سے امتحانات دے چکا تھا اور اب وہ فہیم بن کر اپنی ایک الگ شخصیت کی تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ کرن کی زبان سے رئیس نہیں فہیم کا نام سننا چاہتا تھا۔

ایسا کرنے کے لیے اسے پھر سبزیوں کا ٹھیلا لے کر سردی' گرمی اور برسات میں گلی گلی گھومنا پڑتا پھر بھی اتنی آمدنی نہ ہوتی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھ پاتا۔ بدیع الزماں اسے دو ہزار روپے دے رہا تھا۔ امتحانات کے نتائج خاطر خواہ ہوتے تو وہ ماہانہ چار ہزار روپے دینے والا تھا۔ آئندہ اس کی ماہانہ تنخواہ بڑھتی رہتی۔ اس طرح فہیم بے روزگار نہیں رہتا۔ اس کے گھریلو اور تعلیمی اخراجات بہ آسانی پورے ہوتے رہتے مگر شرط یہی تھی کہ وہ کبھی کسی کے سامنے فہیم کے نام سے نہیں پہچانا جائے گا۔ جب تک اس کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی' وہ رئیس الزماں کہلاتا رہے گا۔

اس طرح وہ پھر مجبور ہو گیا کہ کرن کو ابھی نہ بتائے۔ راز دار تو بیوی ہوتی ہے۔ محبوبہ خواہ کتنی ہی محبت کرے' حالات سے مجبور ہو کر پرائی بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس نے

پھر کرن سے اپنی اصلیت چھپالی۔

امتحانات کے نتیجے کا اعلان ہو گیا۔ رئیس الزماں ولد بدیع الزماں نے اے ون گریڈ حاصل کیا۔ اس نے سب سے زیادہ مارکس حاصل کیے۔ بدیع الزماں کی چاندی ہو گئی تھی۔ اس نے پانچ لاکھ روپے جیت لیے تھے۔ اس نے فہیم اور اس کے باپ کو بلا کر دس ہزار روپے انعام میں دیئے اور اس سے کہا۔ ”تم واقعی ذہین طالب علم ہو۔ تم آئندہ بھی ہمارے کام آتے رہو گے۔ میرے بیٹے کے نام سے انٹر میں داخلہ لو گے۔ میں اگلے ماہ سے تمہیں چار ہزار روپے دیا کروں گا۔“

فہیم نے کہا۔ ”مجھے ڈبل محنت کرنی ہو گی۔ اپنے لیے بھی تعلیمی اسناد حاصل کرنی ہیں اور آپ کے صاحب زادے کے لیے بھی۔ اس لیے ماہانہ چار ہزار میں گزارہ نہیں ہو گا۔“

بدیع الزماں بہت خوش تھا اور بہت موڈ میں تھا۔ اس نے کہا۔ ”ٹھیک ہے چار ہزار نہ سہی، پانچ ہزار دوں گا۔ انٹر کے سیکنڈ ایئر سے تمہیں ماہانہ چھ ہزار ملا کریں گے۔ بولو اب خوش ہو۔“

فہیم کچھ کہنے والا تھا۔ اس سے پہلے اس کے باپ نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”آپ مائی باپ ہیں۔ آپ نے تو ہماری کایا پلٹ دی ہے۔ ہماری تو روج عید ہوا کرے گی۔“

اس کے والدین خوش تھے۔ بیٹے کی قابلیت سے دن پھر گئے تھے۔ وہ پڑھنے کے علاوہ کمانے بھی لگا تھا۔ اس محلے میں کوئی پانچ ہزار کمانے والا ملازم نہیں تھا۔ ماں بیٹے کی بلائیں لے کر کہنے لگی۔ ”اب تو میں چاند سی بہو گھر میں لاؤں گی۔ ناجو کے رُخصت ہونے کے بعد یہ گھر سُونا سُونا سا لگ رہا ہے۔ بہو آئے گی تو رونق آجائے گی۔“

فہیم کا دل بھی یہی چاہتا تھا کہ کرن اس گھر میں دلہن بن کر آجائے اور اس کی ہم راز بن جائے لیکن اس نے ذہانت سے سوچا، وہ دولت مند بدیع الزماں بہت خود غرض ہے۔ اگر وہ کسی سال امتحانات میں اونچی پوزیشن حاصل نہیں کر سکے گا تو وہ اس کی ماہانہ آمدنی روک لے گا۔ وہ دولت کے بل بوتے پر بہت کچھ کر سکتا تھا۔ فہیم کچھ نہیں کر سکے گا پھر گلیوں میں سبزیاں بیچنے چلا آئے گا۔ یوں اپنے ساتھ کرن کا مستقبل بھی برباد ہو جائے

گا۔ دانش مندی یہی تھی کہ وہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھے اور جب کہیں مستقل ملازمت مل جائے تو کرن کو دلہن بنانے کا خواب پورا کرے۔

اپنے ارادوں کو پورا کرنے کا ایک مناسب اور معقول وقت ہوتا ہے۔ وہ ایسے وقت کے انتظار میں بڑی لگن سے پڑھنے اور لکھنے لگا۔ تعلیم کے اس سفر میں کرن اس کے ساتھ تھی۔ اگلے سال دونوں نے بورڈ کے امتحانات دیئے۔ کرن نے اے گریڈ حاصل کیا لیکن فہیم صوبے بھر میں اول آیا۔ اسے ایک برس پہلے ہی بورڈ کے امتحانات دینے کا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس تجربے کی بنا پر اس نے پورے صوبے میں اول پوزیشن حاصل کی۔

کرن اور فہیم کے اسکول الگ تھے۔ امتحان ہال بھی الگ تھے۔ فہیم نے اسے یہ پتا نہیں چلنے دیا کہ وہ رئیس نہیں ہے اور فہیم کے نام سے کامیاب ہوا ہے۔ اخبارات میں نام نہیں، رول نمبر شائع ہوتے ہیں۔ فہیم نے جو رول نمبر کرن کو بتایا تھا، اسے اخبار میں دیکھ کر کرن خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے اپنے اے گریڈ سے زیادہ فہیم کی نمایاں کامیابی پر ناز تھا۔ اس نے اپنی ماں اور ماموں کو بتایا۔ ”دیکھیں اللہ تعالیٰ کس طرح گدڑی میں لعل پیدا کرتا ہے۔ وہ پچھلے برس بیمار ہو گیا تھا ورنہ اب کالج میں ہوتا۔“

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا محبوب رئیس الزماں کی حیثیت سے کالج میں تھا۔ اصلی رئیس الزماں کبھی کبھی کالج اٹینڈ کرتا تھا اور فہیم گھر میں انٹر کا کورس پڑھتا تھا۔ کرن نے کامیابی کے بعد فہیم سے کہا۔ ”ہم اردو کالج میں داخلہ لیں گے۔ میرے گھر کے قریب سے سیدھی ایک بس وہاں جاتی ہے۔ مجھے آنے جانے میں آسانی ہو گی۔“

فہیم کو معلوم تھا کہ رئیس الزماں بھی اردو کالج میں داخلہ لے گا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کالج کا ماحول کافی آزادانہ تھا.......... فہیم نے کرن سے بہانہ کیا کہ دوسرے کالج میں اس کے خاندان کے ایک بزرگ پروفیسر ہیں۔ انہوں نے اسے وہاں داخلہ لینے کی تاکید کی ہے۔ وہ کالج اتنی دور تھا کہ کرن وہاں داخلہ نہیں لے سکتی تھی۔ اسے روزانہ تین بسیں بدل کر وہاں جانا پڑتا۔ اس طرح وہ دونوں دو مختلف کالجوں میں پڑھنے لگے۔

☆========☆========☆

رئیس الزماں نے کرن کو فرسٹ ایئر کی طالبہ کی حیثیت سے دیکھا تو دوسری لڑکیوں

سے لطف لینا بھول گیا۔ اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "یارو! کیا چیز ہے؟ کبھی کبھی ایسے جلوے دیکھنے کو ملتے ہیں۔"

ایک ساتھی نے کہا۔ "فیشن میگزین وغیرہ میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ جلوے دکھاتی ہے مگر یہ تو زندہ حقیقت ہے۔"

رئیس نے کہا۔ "تم لوگ تصاویر دیکھ کر آہیں بھر کر رہ جاتے ہو۔ میں جسے چاہتا ہوں' اسے حاصل کر کے رہتا ہوں۔"

"لڑکی کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ ہاتھ آنے والی نہیں ہے۔"

رئیس نے کہا۔ "ایسے تیور بہت دیکھے ہیں۔ میں ہاتھ ملنا نہیں جانتا۔ ہاتھ میں لے کر مسلنا جانتا ہوں۔ بولو شرط لگاؤ گے؟"

"ابھی ہم لڑکی کے مزاج کو اچھی طرح نہیں جانتے ہیں۔ تم ایک کوشش کرو۔ اگر ناکام رہے تو شرط لگائیں گے تب کامیابی اور ناکامی کا تماشہ دیکھنے کا مزہ آئے گا۔"

جب وہ کالج سے گھر جانے کے لیے بس اسٹینڈ پر آئی تو رئیس اپنے دوستوں کے ساتھ کار میں تھا۔ اسٹاپ سے دور کار روک کر سوچ رہا تھا۔ ایک ساتھی نے پوچھا۔

"یہاں کیوں رک گئے؟"

وہ بولا۔ "شکاری وہ ہوتا ہے' جو پہلے اپنے شکار کے مزاج اور اس کی اوقات کو اچھی طرح سمجھ لیتا ہے۔ پہلے میں اس حسینہ کی ہسٹری معلوم کروں گا۔"

کرن بس میں بیٹھ کر جانے لگی۔ وہ اس بس کے پیچھے کار دوڑانے لگا۔ اس کا پیچھا کرتا ہوا اس کے محلے تک جا پہنچا۔ ذرا دور اپنی کار روک کر دیکھا۔ وہ ایک چھوٹے سے مکان میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک ساتھی نے کہا۔ "یار! کالج میں تو ایسا لباس پہن کر آئی تھی جیسے بڑے باپ کی بیٹی ہو مگر گاڑی ہے' نہ کوٹھی۔ بس میں سفر کرتی ہے اور رہتی ہے ایسے مکان میں جس پر رنگ و روغن تک نہیں ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "پتا نہیں اپنا مکان ہے یا کرائے کا ہے مگر اوقات کا پتا چل گیا ہے۔"

رئیس نے مسکرا کر کہا۔ "یہی سب دیکھنے کی چیزیں ہوتی ہیں۔ شکار کی بہت سی

کمزوریاں معلوم کرنے کے بعد اس پر غالب آنا آسان ہوتا ہے۔"

وہ کار اسٹارٹ کر کے اپنے ساتھیوں کے ساتھ واپس چلا گیا۔ دوسرے دن وہ کالج آئی تو اس نے راستہ روک کر پوچھا۔ "کیا تم نئی ہو؟ فرسٹ ایئر میں ہو؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ہاں۔ آج میرا کالج میں دوسرا دن ہے۔"

"میں سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہوں۔ تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہاں کے لڑکے بڑے دل پھینک ہوتے ہیں۔ نئی لڑکی آئے تو اسے پھانسنے میں دیر نہیں لگاتے۔ تمہیں یہاں کسی نے چھیڑا تو نہیں ہے؟ اگر کوئی بدتمیزی کرے تو مجھے بتانا۔ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ میں ایک بہت بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔ کیا تم اپنی گاڑی میں آتی ہو؟"

"نہیں۔ میں ایک کچی آبادی میں رہتی ہوں اور بس میں آتی ہوں۔"

"تعجب ہے۔ دیکھنے میں رئیس زادی لگتی ہو۔ کوئی بات نہیں۔ میری اپنی کار ہے۔ میں تمہیں گھر تک پہنچا دیا کروں گا۔"

"تم نے ابھی کہا تھا کہ یہاں کے لڑکے کسی نئی لڑکی کو پھانسنے میں دیر نہیں کرتے اور واقعی تم دیر نہیں کر رہے ہو۔ میرے پیچھے دوسری لڑکیاں آرہی ہیں۔ ان سے پوچھو' شاید کوئی تمہاری کار میں جانا پسند کرے۔ مجھ سے کبھی ایسی توقع نہ رکھنا۔"

وہ حقارت سے "اونہہ" کہہ کر چلی گئی۔ اس کے ساتھی دور سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے قریب آکر پوچھا۔ "کیا ہوا؟ پھنسی؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "بہت ٹیڑھی ہے۔ اسے سیدھا کرنا ہوگا۔"

ایک ساتھی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے' ہار جیت کی شرط لگائی جا سکتی ہے۔"

رئیس نے کہا۔ "یہ ہے کیا چیز کہ شرط لگائی جائے۔ اسے تو میں چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔"

"اور ایسا نہ کر سکے تو؟"

"تو شرط لگاؤں گا۔ جتنی بھی شرط لگاؤ گے' اسے بیڈ روم میں لے جا کر بازی جیت لوں گا۔"

"کوئی بات نہیں' کل ایک دن اور کوشش کر لو۔ پرسوں شرط لگائی جائے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو۔ میں پلاننگ کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کے ساتھی دور چلے گئے۔ ایک لڑکی قریب سے گزر رہی تھی۔ رئیس نے کہا۔

"ہیلو امبر! ذرا ایک منٹ۔"

وہ رک گئی۔ رئیس نے کہا۔ "میں تمہاری پرابلم جانتا ہوں۔ تم نے اب تک فیس جمع نہیں کی ہے۔ میں نیک نیتی سے تمہیں رقم دے رہا ہوں اور تم مجھے بدنیت سمجھ رہی ہو۔"

"تم میری فیس کیوں دینا چاہتے ہو؟ کوئی تو مقصد ہو گا؟"

"یوں تو میں مجبور طلبہ اور طالبات کی مدد کرتا رہتا ہوں لیکن تم سے ایک کام لینا چاہتا ہوں۔"

"کیسا کام؟"

"تمہاری کلاس میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ اس کا نام کرن خورشید ہے۔ تم صرف اتنا معلوم کرو' کیا وہ کسی لڑکے سے محبت کرتی ہے؟"

اس نے جیب سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے۔ وہ نوٹ لے کر بولی۔ "یہ تو بہت ہیں۔ مجھے صرف فیس کی رقم چاہیے۔"

"مجھے روپے گننے کی نہیں' خرچ کرنے کی عادت ہے۔ میں ہر ماہ تمہاری فیس دیا کروں گا۔ تم صرف اتنا ہی کرو جو میں نے کہا۔ میں کلاس ختم ہونے کے بعد تم سے ملوں گا۔"

وہ چلی گئی۔ رئیس نے اپنے دوستوں کے پاس آ کر کہا۔ "میں اپنے شکار کے بارے میں یہ معلوم کرنا بھول گیا تھا کہ وہ پہلے سے کسی میں انٹرسٹڈ تو نہیں۔"

ایک دوست نے پوچھا۔ "اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے تو؟"

"تو دیوار گرانی ہو گی۔ رقیب سے بھی نمٹنا ہو گا۔"

وہ لڑکی امبر کلاس ختم ہونے سے پہلے ہی آ گئی۔ رئیس سے بولی۔

"میں سمجھتی تھی کہ تم بہت چالاک ہو مگر لڑکیوں کو سمجھنے کے معاملے میں بالکل اناڑی ہو۔"

"میں اور اناڑی؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ کرن تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے اور تم سمجھ رہے ہو کہ وہ کسی دوسرے لڑکے سے محبت کرتی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا کرن نے تم سے میرے بارے میں کچھ کہا ہے؟"

"کہنا کیا ہے؟ مجھے تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں کلاس میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ اس کتاب پر تمہارا نام لکھا ہوا تھا.......... رئیس الزماں۔"

رئیس نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہو؟ اس نے اپنی کتاب پر میرا نام لکھا ہوا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے انجان بن کر اس سے پوچھا' یہ رئیس الزماں کون ہے؟ تو وہ شرمانے لگی۔"

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "تعجب ہے۔ اس نے تو میری محبت کا جواب روکھے پن سے دیا تھا۔"

"تو پھر مان لو کہ اناڑی ہو۔ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ لڑکیوں کی "نہ" کے پیچھے "ہاں" چھپی ہوتی ہے۔ پہلے وہ اپنی ایسی ہی اداؤں سے دیوانہ بناتی ہیں پھر ایک دن محبت کا اقرار کر لیتی ہیں۔"

"پھر تو واقعی میں اناڑی ہوں۔ تمہارا شکریہ۔ تمہارا شکریہ امبر' تم نے میرا دماغ روشن کر دیا ہے۔ وہ مجھے اناڑی سمجھتی ہے۔ اب مزہ آئے گا۔"

امبر چلی گئی۔ وہ پھر دوستوں کے پاس آ کر بولا۔ "کیوں یارو! شرط لگاتے ہو؟"

ایک نے پوچھا۔ "ارے واہ' یہ امبر کے ذریعے کیا چکر چلایا ہے تم نے؟"

"جیسا بھی چکر چلایا ہو' شرط لگاتے ہو یا نہیں؟"

"بھئی معاف کرو۔ تم نہیں ہارو گے۔ اسے جیت لینے کی کوئی چال چلی ہے تم نے۔"

وہ فاتحانہ انداز میں ہنسنے لگا۔ اسی وقت گھنٹی بجنے لگی۔ دوستوں نے پوچھا۔ "دوسری

کلاس شروع ہونے والی ہے۔ آؤ چلیں۔"

رئیس نے کہا۔ "تم لوگ جاؤ۔ آج تو مجھ سے کلاس میں بیٹھا نہیں جائے گا۔ پڑھا بھی نہیں جائے گا۔ آنکھوں کے سامنے اسی کی صورت گھومتی رہے گی۔"

اس کے دوست چلے گئے۔ وہ لائبریری میں آکر بیٹھ گیا۔ کرن کے متعلق سوچنے لگا۔ آج کالج میں کرن کا دوسرا دن ہے۔ شاید اس نے پہلے ہی دن سے اسے دیکھا ہوگا۔ کسی لڑکے سے اس کا نام پوچھا ہوگا تب ہی اس کی کتاب پر اس کا نام لکھا ہوا ہے۔

اس نے مسکرا کر اپنی جیب سے بے بی آئینہ نکال کر خود کو دیکھا۔ اپنی انگلیوں سے بالوں کو درست کیا۔ وہ فخر سے کہتا تھا۔ کہ لڑکیاں اس کی دولت سے نہیں' اس کی صورت اور شخصیت سے متاثر ہو کر اس کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

چھٹی کے وقت وہ لائبریری سے باہر آیا۔ کرن ایک لڑکی سے باتیں کرتی ہوئی کالج کی عمارت سے باہر نکل رہی تھی۔ اس نے تیزی سے قریب آکر کہا۔ "ہیلو کرن! میں تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

اس لڑکی نے کرن سے کہا۔ "اچھا میں چلتی ہوں۔"

"نہیں ٹھہرو۔ میں ساتھ چل رہی ہوں۔ ہمیں ایک ہی بس میں جانا ہے۔"

پھر وہ رئیس سے بولی۔ "ہاں ایسی کیا بات ہے جسے تنہائی میں کہنا چاہتے ہو؟"

"تم تنہائی نہیں چاہتیں' نہ سہی۔ میں صرف ایک منٹ کے لیے تمہاری یہ کتاب دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اگر میں نہ دکھاؤں تو؟"

"تب بھی میں تمہاری کتاب اور تمہارے دل میں رہوں گا اور تم جھوٹ موٹ میری محبت سے انکار کرتی رہو گی۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے؟ کیا پرنسپل سے شکایت کروں؟"

وہ بولا۔ "تم لڑکیوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ کیا پرنسپل کے سامنے کتاب کھول کر میرا نام دکھاؤ گی؟"

"تمہارا نام اور میری کتاب میں؟"

"کیا اس کتاب میں میرا نام رئیس الزماں نہیں لکھا ہوا؟"

وہ حیران ہو کر بولی۔ "کیا تمہارا نام رئیس الزماں ہے؟"

"کیوں انجان بن رہی ہو؟ سارا کالج جانتا ہے۔ صرف مرسڈیز جیسی کار میں بیٹھ کر آنے والے کا نام رئیس الزماں ہے۔"

"اب سمجھی۔ جناب کا نام رئیس الزماں ہے اور جناب کو یہ غرور ہے کہ یہ نام صرف مرسڈیز میں بیٹھنے والے کا ہوتا ہے۔ کسی سبزی فروش کا یہ نام نہیں ہو سکتا؟"

رئیس الزماں نے ایک دم سے چونک کر کرن کو دیکھا۔ فوراً یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ فہیم الزماں کو رئیس الزماں کہہ رہی ہے۔ کل وہ کار میں کرن کا تعاقب کرتا ہوا جس علاقے میں گیا تھا اسی کے قریب کسی کچی آبادی میں فہیم بھی رہتا ہے۔ وہ اسے رئیس الزماں کے نام سے جانتی ہوگی بلکہ جانتی ہے اور اس سے عشق کرتی ہے۔ اسی لیے کتاب میں اس کا نام محبت سے لکھ رکھا ہے۔

وہ فہیم کے حوالے سے بہت سی باتیں سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ وہ غصے سے تلملا کر رہ گیا۔

☆=========☆=========☆

شام کو کرن نے حسبِ معمول فہیم سے ملاقات کی۔ مسکرا کر اس سے بولی۔ "آج بڑا مزہ آیا۔ ہمارے کالج میں ایک رئیس زادہ پڑھتا ہے۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ اس کا نام رئیس الزماں ہے۔ پہلے اس نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا پھر کیا ہوا' جانتے ہو؟"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر ہنسنے لگی۔ فہیم سمجھ گیا کہ وہ رئیس الزماں وہی بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ اس نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

وہ بولی۔ "میں نے اپنی کتاب میں تمہارا نام لکھ رکھا ہے۔ یہ بات اسے معلوم ہو گئی اور وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ میں اسے چپکے چپکے دل میں چاہتی ہوں اور اس کا نام اپنی کتاب میں لکھ کر رکھتی ہوں۔"

"تم نے اس کی خوش فہمی دور کی ہوگی؟"

"ہاں' میں نے کہا کہ صرف مرسڈیز میں بیٹھ کر آنے والے کا نام رئیس الزماں نہیں ہوتا۔ ایک سبزی فروش کا نام بھی رئیس الزماں ہوا ہے اور میری کتاب میں اسی محبوب کا نام ہے۔"

"اس کا ردعمل کیا تھا؟"

"وہی جو نیوٹن کے تیسرے قانونِ حرکت کا ہونا چاہیے تھا۔ تم ایک دیوار تھے۔ وہ گیند کی طرح آکر تمہارے نام سے ٹکرایا اور واپس چلا گیا بلکہ وہیں کھڑا سوچتا رہ گیا۔"

"اس نے تم سے بدتمیزی تو نہیں کی؟"

"بدتمیزی کرتا تو میں پرنسپل سے شکایت کر دیتی۔"

"ایسے بگڑے ہوئے رئیس زادے پرنسپل وغیرہ کی ہونس میں نہیں آتے۔ وہ ایسا کمینہ ہے کہ آئندہ بھی چھیڑے گا۔"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اسے جانتے ہو۔"

"شیطانی خصلت رکھنے والے رئیس زادوں کو سب ہی جانتے ہیں۔ میں اس کی عقل ٹھکانے لگا دوں گا۔"

"خواہ مخواہ طیش میں نہ آؤ۔ اب وہ مجھے نہیں چھیڑے گا۔"

"کیا سانپ کبھی ڈسنا چھوڑتا ہے؟"

"اوہو' تم تو ذرا سی بات کو طول دے رہے ہو۔"

"اس نے تمہیں چھیڑا' یہ ذرا سی بات ہے؟ میرا خون کھول رہا ہے تم صرف میری محبت نہیں' میری غیرت بھی ہو۔ کوئی غیرت کو للکارے گا' تو کیا میں اسے آسانی سے چھوڑ دوں گا؟"

"میں تو بتا کر پچھتا رہی ہوں۔ کچھ نہ کہتی تو اچھا ہوتا۔ پلیز غصہ تھوک دو۔ مجھ پر بھروسا کرو۔ میں موم کی گڑیا نہیں ہوں۔ اسے دن میں تارے دکھا دوں گی۔"

وہ جانتا تھا' کرن بہت تیز طرار ہے۔ کسی رئیس کے جھانسے میں نہیں آئے گی لیکن اسے یہ سوچ کر غصہ آرہا تھا کہ اس نے ایک مغرور اور بدکار رئیس زادے کا نام کیوں اپنایا؟ اسے دراصل غصہ اپنے آپ پر آرہا تھا۔ وہ فہیم کی محبوبہ تھی لیکن محبوبہ کی زبان پر

اور اس کی کتاب پر فہیم کا نہیں' رئیس الزماں کا نام رہتا تھا۔ اس میں رئیس الزماں کا کیا قصور تھا؟ چیک پر جس کے نام کا سائن ہو گا' وہ چیک تو اسی کے نام کیش ہو گا۔

اس شام فہیم نے جلدی جانے کے لیے بہانہ کیا کہ اس کی ماں بیمار ہے۔ دونوں بس اسٹاپ پر آئے۔ کرن اپنے گھر جانے والی بس پر بیٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد فہیم ڈیفنس والی ایک بس میں بیٹھ کر بدیع الزماں کی کوٹھی میں آیا۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ کہیں باہر جانے والا تھا۔ جانے سے پہلے ڈرائنگ روم میں ایک فون اٹینڈ کر رہا تھا۔ بیگم نے فہیم کو دیکھ کر پوچھا۔ "کیوں آئے ہو؟ یہاں کے ملازم اور گارڈ تمہیں پہچان کر آنے کی اجازت دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم دستک دیئے بغیر اپنا گھر سمجھ کر اندر گھسے چلے آؤ۔"

فہیم نے گھور کر بیگم کو دیکھا لیکن اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ بدیع الزماں نے ریسیور رکھ کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟ تم نے یہاں آنے سے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی؟"

وہ بولا۔ "آپ کے دربار میں سب ہی اطلاع دے کر اور اجازت لے کر آتے ہیں لیکن موت آنے سے پہلے آپ کے بیٹے کو اطلاع نہیں دے گی۔"

بدیع الزماں نے غصے سے پوچھا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"میں جس لڑکی سے شادی کرنے والا ہوں' اس کا نام کرن ہے۔ آپ کے بیٹے نے آج اسے کالج میں چھیڑا تھا۔ اگر میں وہاں موجود ہوتا تو آپ اس سے ملاقات کرنے اسپتال جاتے۔ آپ کو سمجھانے آیا ہوں کہ اسے انسان بنا دیں یا اپنے سیکیورٹی گارڈز اس کے ساتھ رکھیں۔ اس کے باوجود یہ نہ بھولیں کہ سیکیورٹی گارڈز کی موجودگی میں بھی موت آتی ہے۔ اس کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا۔"

بدیع الزماں ہکا بکا سا اس کا منہ تک رہا تھا۔ بیگم نے کہا۔ "یہ ہمارے بیٹے کے بارے میں کیسی منحوس باتیں کر رہا ہے۔ ہمیں چیلنج کر رہا ہے اور آپ خاموشی سے سن رہے ہیں؟"

وہ بولا۔ "بیگم! بات اور حالات کو سمجھو۔ یہ ہمارے مقابلے کا نہیں ہے مگر ہماری طرح پٹھان ہے۔ خون میں گرمی ہے۔ یہ اس لڑکی کی خاطر غیرت میں آکر کچھ بھی کر سکتا

ہے۔ اگر ہمارے بیٹے سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اس نے ایسی غلطی کیوں کی۔ ہم دولت مند ہیں اور طاقت ور ہیں۔ اس کے باوجود اس جوان سے سمجھوتا کرنا ہے۔"

پھر اس نے فہیم سے کہا۔ "تمہاری جو بات سہولت سے مان لی جائے' اس پر غصہ نہ دکھاؤ۔ اگر میرے بیٹے نے کوئی غلطی کی ہے تو اس کی تلافی ہو جائے گی۔ اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو اور اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟"

دروازے پر سے رئیس الزماں کی آواز آئی۔ "ڈیڈ' کچھ نہیں ہوا۔ غلط فہمی ہوئی ہے۔"

رئیس الزماں کے ساتھ ایک گارڈ گن لیے کھڑا تھا۔ وہ بولا۔ "اگر یہ بات کو سمجھے بغیر یہاں غنڈا بننے آیا ہے تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔ بہتر ہے کہ اپنی اوقات میں رہ کر بات کرے۔"

فہیم نے کہا۔ "اپنے گن مین پر بھروسہ نہ کرنا۔ میں ایک منٹ میں تمہاری اوقات تمہیں سمجھا دوں گا۔ مرد کے بچے ہو تو اندر آؤ۔"

وہ دونوں ایک دوسرے سے ذرا دور تھے۔ بدیع الزماں نے ان کے درمیان آکر کہا "میں تم دونوں کو سمجھاتا ہوں۔ کوئی ایک دوسرے سے نہ بولے اور نہ ہی کسی طرح کا چیلنج کرے۔ میں اس معاملے کو سمجھوں گا اور فیصلہ کروں گا۔ بیٹے! تم بتاؤ' کیا تم نے اس کی ہونے والی بیوی کو چھیڑا تھا؟"

"ڈیڈ! میں نے معلوم کر لیا ہے۔ وہ اس کی ہونے والی بیوی نہیں ہے۔ یہ اس کے گھر سے باہر کہیں ملتا ہے۔ اس لڑکی نے محبت سے اس کا نام اپنی کتاب میں لکھا ہے اور رئیس الزماں لکھا ہے۔ مجھے غلط فہمی ہوئی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ آپ بتائیں' کیا ایسے میں غلطی نہیں ہو سکتی؟"

"بے شک ایسے میں غلطی ہو سکتی ہے۔ فہیم! عقل سے سوچو' دونوں کے نام ایک ہی ہیں۔ میرے بیٹے نے اس نام کو اپنا نام سمجھا۔ تم سے جان بوجھ کر دشمنی نہیں کی ہے۔"

"لیکن اس نے کرن کو چھیڑا کیوں؟"

"فہیم! تم اپنی چیزوں پر اپنا حق جتا سکتے ہو لیکن.......... کرن تمہاری کوئی نہیں ہے۔ یہ دعوٰی نہ کرو کہ وہ تمہاری ہونے والی بیوی ہے۔ کیا اس سے منگنی ہو چکی ہے؟ کیا تمہارے اور اس کے والدین تمہاری خفیہ ملاقاتوں کے بارے میں جانتے ہیں؟"

"نہیں مگر ہم انہیں مناسب وقت پر بتانے والے ہیں۔"

"یعنی ابھی بتایا نہیں ہے؟ محبت نہیں کر رہے ہو' چوری کر رہے ہو۔ ایک پرائی لڑکی کے والدین کو دھوکا دے رہے ہو۔ اگر کالج جا کر یہی سب کچھ ہوتا ہے تو میرا بیٹا بھی وہی کر رہا ہے جو تم کر رہے ہو۔ میں تم سے انصاف کروں گا۔ اگر وہ لڑکی تمہاری کچھ لگتی ہے تو جاؤ پہلے اسے اپنے نام سے منسوب کرو پھر یہاں آکر اپنا حق جتاؤ۔"

فہیم ان باتوں کا جواب نہ دے سکا کیونکہ بدیع الزماں انصافاً درست کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ہمارے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔ ان تعلقات کو جوش میں آکر نہ بگاڑو۔ ہماری.......... بھلائی اسی میں ہے کہ ہم ایک دوسرے کے کام آتے رہیں۔ اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہے تو تم جا سکتے ہو۔"

فہیم سوچتا ہوا' سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رئیس الزماں نے کہا "ڈیڈ! اس کے ساتھ اتنی سہولت سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم اس کا نہیں کھاتے' یہ ہمارا نمک کھاتا ہے۔ آپ اسے سر پر چڑھا رہے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ ہمیشہ سیاست سے کام لیتے ہیں لیکن ایسے نمک حرام کے سامنے جھکنا' کیا سیاست ہے؟ وہ ہمارے سامنے ہمارے بیٹے کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکی دے رہا تھا۔"

رئیس الزماں نے کہا۔ "میں یہ توہین برداشت نہیں کروں گا۔ وہ جس طرح ہماری توہین کر کے گیا ہے' اس کا انتقام ضرور لوں گا۔"

باپ نے کہا۔ "انتقام لینے سے پہلے سوچو کہ آئندہ تمہاری جگہ کون امتحان دے گا۔ کیا تمہارے پاس ایسی ذہانت ہے؟"

"جو چیز ہمارے پاس نہیں ہوتی' وہ بازار سے خرید لی جاتی ہے۔ فہیم جیسے بے شمار

نوجوان اپنی ذہانت کا سرٹیفکیٹ لیے نوکری کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے کتنے ہی فہیم کی طرح اپنی ذہانت بیچ سکتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا ہے۔ ہمیں فہیم کو منہ توڑ جواب دینا چاہیے۔"

بدیع الزماں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "پہلے اسے ماہانہ دو ہزار روپے دیئے جاتے تھے۔ اب پانچ ہزار روپے دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی اوقات بھول کر سر پر چڑھتا جا رہا ہے۔ پہلے بھی ایک بار اس نے بدتمیزی کی تھی۔ آج تو جانی دشمن بن کر آگیا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسے ٹال دیا ہے لیکن اب وہ مجھے پتھر کی طرح آکر زخمی کر رہا ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ اسے ایسی سزا دیں کہ وہ اپاہج بن کر فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے لگے۔"

"ہوں۔ کچھ ایسا ہی سلوک اس کے ساتھ کرنا ہوگا۔"

وہ صوفے پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

☆=========☆=========☆

بدیع الزماں کی یہ بات فہیم کے دل کو لگ گئی تھی کہ کرن اس کی جانِ حیات ہو کر بھی اس کی کچھ نہیں لگتی ہے۔ وہ اس کی جاگیر نہیں ہے۔ وہ اخلاق اور تہذیب کے خلاف اس پر اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ اگر اس رئیس زادے سے اس کا جھگڑا بڑھ جاتا تو اس جھگڑے میں کرن بدنام ہوتی۔ وہ بھی اپنی زبان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ فہیم کی کچھ لگتی ہے۔

ماں نے اسے پریشان دیکھ کر پوچھا۔ "بیٹے' کیا بات ہے' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی ہاں۔ ٹھیک ہوں۔"

"پھر اتنے چپ چپ سے کیوں ہو؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

"وہ۔ امی! ایک بات ہے۔"

"کیا بات ہے بیٹے! کوئی پریشانی ہے؟"

"نہیں۔ وہ۔ وہ آپ۔ گھر میں بہو لانا چاہتی ہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو میں سال بھر سے کہہ رہی ہوں۔ تمہارے ابا بھی یہی چاہتے ہیں مگر تم پہلے پڑھائی پوری کرنا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔ دانش مندی تو یہی ہے۔ پہلے اس قابل ہو جاؤں کہ کسی بڑی کمپنی میں پکی ملازمت کر لوں لیکن میں ایک لڑکی کو پسند کرتا ہوں۔"

ماں باپ نے اسے خوش ہو کر دیکھا۔ باپ نے کہا۔ "بیٹے! پسند کرتے ہو تو بتاؤ۔ یہ بھی کوئی چھپانے کی بات ہے۔"

"لیکن میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ صرف منگنی کرانا چاہتا ہوں۔ جب اچھی ملازمت ملے گی تو پھر شادی کی تاریخ طے کرلیں گے۔"

ماں نے کہا۔ "تم جیسا چاہو گے' ویسا ہی ہو گا۔ لڑکی کون ہے؟ کہاں رہتی ہے؟"

اس نے کرن کا نام اور اس کے گھر کا پتا دیا۔ اس کے ماں باپ اسی شام وہاں پہنچ گئے۔ کرن گھر میں نہیں تھی۔ اس کا ماموں عبید الرحمان دفتر سے آنے کے بعد چائے پی رہا تھا۔ دروازے پر دستک سن کر اس نے دروازہ کھولا۔ باہر صابرہ اپنے شوہر کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ہم آپ سے دو باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اندر آسکتے ہیں؟"

عبید الرحمان نے کہا۔ "ہاں آیئے۔ تشریف لایئے۔"

اس نے اندر بلا کر انہیں کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا پھر بہن کو آواز دی۔ کرن کی ماں نے آکر انہیں دیکھا پھر دعا سلام کے بعد پوچھا۔ "آپ وہی بابا ہیں نا جو سبزیاں بیچا کرتے تھے؟"

عبیدالرحمان نے کہا۔ "ہاں۔ یہ وہی ہیں جن کے بیٹے کی تم تعریفیں کیا کرتی ہو۔"

صابرہ اور بدیع الزماں خوش ہو گئے۔ وہ بولا۔ "یہ ہمارے لیے کھسی کی بات ہے کہ آپ ہمارے بیٹے کو جانتے ہیں اور اس کی تاریپھیں بھی کرتے ہیں۔ وہ بہت کابل ہے۔ پانچ ہجار روپیہ مہینہ کماتا ہے۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے اس سال ہیڈ کلرک کے عہدے پر ترقی ملی ہے پھر بھی تنخواہ پانچ ہزار نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا تو خاصا کما لیتا ہے۔"

کرن کی ماں نے پوچھا۔ "اب تو آپ سبزیاں نہیں بیچتے ہوں گے؟"

"جرورت ہی کیا ہے؟ اگلے برس بیٹے کی تنکھا چھ ہجار روپے ہو جائے گی۔"

کرن کی ماں نے کہا۔ "ماشاء اللہ آپ کا بیٹا آئندہ بہت ترقی کرے گا۔"

صابرہ نے کہا۔ "ہم اپنے بیٹے کے لیے ہی آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہماری دلی آرجو ہے کہ آپ اسے اپنا بیٹا بنالیں۔ ہم آپ کی کرن کو اپنی بیٹی بنالینا چاہتے ہیں۔"

کرن کی ماں اور ماموں کو چپ سی لگ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

صابرہ نے کہا "ہم چھوٹے لوگ ہیں۔ بڑی بات کہہ رہے ہیں مگر ہمارا بیٹا کابلیت میں بہت بڑا ہے۔"

کرن کی ماں نے کہا۔ "کرن کے لیے پہلے کئی رشتے آچکے ہیں۔ خاندانی رئیسوں کے ہاں سے بھی پیغامات آرہے ہیں۔ ہم نے ابھی کسی کو ہاں میں جواب نہیں دیا ہے۔ کرن پہلے' تعلیم مکمل کرلے پھر ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"ہمارا بیٹا بھی پہلے تعلیم پوری کرنا چاہتا ہے۔ ہم تو بس اتنا چاہتے ہیں کہ منگنی ہو جائے پھر تعلیم کے بعد شادی ہو جائے گی۔"

"بہن! ہم اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ منگنی کے بعد بیٹی کو برسوں گھر میں بٹھائے رکھیں پھر یہ کہ آپ رشتہ مانگنے آئی ہیں۔ ہمیں کچھ سوچنے کا موقع تو دیں گی۔"

"ہاں یہ تو اصول کی بات ہے۔ آپ جرور سوچیں۔ ہم پھر آئیں گے۔"

"آپ آنے کی زحمت نہ کریں۔ آپ سوالی بن کر آئی ہیں۔ ہم جواب دینے خود آئیں گے۔"

وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ "اچھا ہم جا رہے ہیں۔"

وہ جانے لگے۔ کرن کی ماں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "سنئے! کیا آپ کے بیٹے کا نام رئیس الزماں ہے؟"

"جی ہاں۔ رئیس الجمع ہے۔"

یہ کہہ کر صابرہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی۔ عبیدالرحمان نے دروازہ بند کر کے بہن سے کہا۔ "لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ ماہانہ پانچ ہزار روپے کمانے لگتے ہیں تو اپنی اوقات بھول جاتے ہیں کہ سبزیاں بیچنے والے تھے۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ پیشہ اور خاندان دیکھ کر رشتہ مانگنا چاہیے۔"

"اسی لیے میں نے باتیں بنا کر ٹال دیا ہے۔ میں نے اس لڑکے کو دیکھا ہے' بہت اچھا ہے۔ بہت قابل ہے مگر یہ لوگ ہمارے رسم و رواج اور ہمارے خاندان سے بالکل مختلف ہیں۔"

عبیدالرحمان نے کہا۔ "اور شاید ان کے خاندان میں وہی ایک تعلیم یافتہ ہے۔ باقی سب ایسے ہی ہیں۔ صحیح الفاظ بھی ادا نہیں کرتے ہیں۔ تنخواہ کو تنکھا اور ہزار کو ہجار کہتے ہیں۔ ہمارے خاندان میں بیٹھیں گے تو ان کی ہنسی اڑائی جائے گی۔"

کرن کی ماں نے پریشان ہو کر کہا۔ "مگر ایک بات مجھے الجھا رہی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"میں نے جاتے وقت ان کے بیٹے کا نام پوچھا تھا۔ انہوں نے رئیس الزماں بتایا ہے۔"

"اس میں الجھن کی کیا بات ہے؟"

"ہے۔ میں نے کرن کی ایک کتاب اور ڈائری میں رئیس الزماں کا نام لکھا ہوا دیکھا ہے۔"

"اوہ!" عبیدالرحمان نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تو یہ بات ہے۔"

"یہی تو الجھن ہے۔ آج کل کی جوان لڑکیاں اور لڑکے خاندان' برادری اور رسم و رواج کے فرق کو نہیں سمجھتے ہیں۔"

"نہیں سمجھتے ہیں تو انہیں سمجھانا ہو گا۔ یہ تعلیم کس لیے حاصل کر رہے ہیں۔ انہیں ہیرے اور پتھر کی پہچان ہونی چاہیے۔"

وہ دونوں بہن بھائی بڑی سنجیدگی سے کرن کے بارے میں سوچنے لگے۔ اس کی کتاب اور ڈائری میں لکھا ہوا نام ان کے دلوں میں کیل کی طرح چبھ رہا تھا۔

فہیم نے رات کو گھر آکر پوچھا۔ "کیا ہوا امی! آپ وہاں گئی تھیں؟"

"ہاں بیٹے! تمہارے ابا کے ساتھ گئی تھی۔ وہ تمہاری بڑی تاریفیں کر رہے تھے مگر........"

"مگر کیا؟"

"جب ہم نے کرن کا رستہ مانگا تو انہوں نے "نہ" کہا اور نہ "ہاں" کہا۔ ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے انہوں نے ٹال دیا ہے۔"

"آخر انہوں نے کیا کہا ہے؟"

"کہہ رہے تھے' ابھی وہ تعلیم حاصل کر رہی ہے۔میں نے کہا' کوئی بات نہیں' پہلے منگنی کر لیتے ہیں۔ پڑھائی پوری ہونے کے بعد سادی ہو جائے گی۔لیکن کہنے لگیں کہ وہ منگنی کے بعد بیٹی کو برسوں گھر میں بٹھا کر نہیں رکھتے ہیں پھر چلتے وکت کہا۔ ہم نہ آئیں۔

وہ کھد جواب دینے آئیں گے۔"

باپ نے کہا۔ "بیٹے۔ یہ صاپھ ٹالنے والی بات ہے۔ کیا پڑھے لکھے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک پیالی چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔"

فہیم مایوس ہو کر اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ رات کے کھانے کے لیے ماں نے پوچھا اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔ باپ نے آکر سمجھایا۔ "بیٹے! تم تو سمجھ داروں سے بھی زیادہ سمجھ دار ہو۔ ہم تم پر بہت ناج کرتے ہیں۔ ناکامی ہو تو آدمی کھانے سے ناراج نہیں ہوتا۔ کیا ناراج ہونے سے لڑکی والے راجی ہو جائیں گے؟"

"ابا! میں کھاؤں گا مگر دیر سے۔ ابھی تو سوچ رہا ہوں کہ ہم کیسی دنیا میں رہتے ہیں۔ میری قابلیت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن مجھے کم تر سمجھتے ہیں کیونکہ میں سبزیاں بیچتا رہا تھا۔"

"بیٹے! کیا سبجیاں بیچنے والے انسان نہیں ہوتے؟ اگر ہوتے ہیں تو کیا سریپھ نہیں ہوتے؟"

فہیم نے کہا۔ "ہمارے لوگوں کی سوچ عجیب و غریب ہے۔ جوتے مرمت کرنے والے کو حقارت سے موچی کہتے ہیں۔ وہی موچی بڑی بڑی مشینوں کے ذریعے جوتے تیار کرے تو ساری دنیا میں باٹا شوز کا بہت بڑا بزنس مین کہلاتا ہے۔ گھاٹ پر کپڑے دھونے والا حقارت سے دھوبی کہلاتا ہے۔ اگر وہ ڈرائی کلیننگ کی مشین نصب کروا لے تو بہت بڑا لانڈری کا معزز کاروبار بن جائے گا۔ ہم تھیلے پر سبزیاں رکھ کر گلی گلی آوازیں لگاتے تھے۔ اگر ہم ایک بہت بڑی مارکیٹ میں بہت بڑی سبزیوں کی دکان سجا لیتے تو آج معزز کاروباری طبقے میں ہمارا شمار ہوتا۔ آپ کے اعزاز میں دعوتیں دی جاتیں۔ جب کہ امی اور ابا کو ایک پیالی چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا گیا۔"

وہ بیٹے کو تھپک کر بولا۔ "کوئی بات نہیں۔ ہم چائے کے بھوکے نہیں۔ محبت کے بھوکے ہیں۔ ہم نے گھر آکے چائے پی لی تھی۔"

باپ سمجھا کر چلا گیا۔ اس نے آدھی رات کو کھانا کھا لیا مگر نیند نہیں آرہی تھی۔ بدیع الزماں کی بات پتھر کی طرح لگ رہی تھی کہ کرن اس کی کچھ نہیں لگتی ہے اور کرن کے بزرگوں کا رویہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ آئندہ بھی اس سے منسوب نہیں ہو سکے گی۔

وہ پریشانی سے کبھی بیٹھتا، کبھی بستر پر لیٹا رہا پھر وہ اٹھ کر اپنی میز کے پاس آیا اور کاغذ قلم لے کر لکھنے لگا۔

"کرن! میں بہت مشکل میں ہوں مگر نہیں، پریشانی چھوٹی سی بات ہے۔ میں تمہارے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔ کوئی تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو میں کس رشتے سے تمہارا محافظ بن سکتا ہوں۔ میری حمایت اور محبت سے تم بدنام ہو جاؤ گی۔

"میں نے امی اور ابا کو تمہارے گھر بھیجا تھا۔ میں چاہتا تھا ہمارا رشتہ طے ہو جائے اور تم میری منگیتر بن جاؤ لیکن میرے والدین کے ساتھ تمہارے بزرگوں کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ خدا کے لیے اپنے بزرگوں کو سمجھاؤ۔ اگر تم مجھ سے منسوب نہ ہوئیں تو تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تم مجھ سے منسوب نہ ہوئیں تو میں تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا لیکن کسی دوسرے کی نہیں ہونے دوں گا۔

"کل چھٹی کا دن ہے۔ تم کالج نہیں آؤ گی اور نہ ہی مجھ سے پارک میں مل سکو گی اس لیے خط لکھ رہا ہوں خدا کے لیے اپنے بزرگوں کو رشتے کے لیے راضی کرو۔ میں رضا مندی چاہتا ہوں۔ انکار سننا نہیں چاہتا۔ فقط رئیس الزماں۔"

اس نے اپنی تحریر پڑھی پھر اس کاغذ کو تہہ کیا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ وہ دبے قدموں سے اپنے کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے سے گزرنے لگا۔ اس کے والدین گہری نیند میں تھے۔ وہ صبح بیدار ہونے کے عادی تھے مگر پچھلی رات بیٹے کی پریشانی کے باعث دیر تک جاگتے رہے تھے اس لیے اب گہری نیند سو رہے تھے۔

وہ آنگن سے گزر کر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آیا پھر دروازے کو باہر سے بند کر کے کرن کے مکان کی طرف جانے لگا۔ کرن کا گھر اس کے گھر سے تقریباً تین کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔ وہاں پہنچنے تک صبح کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے دور سے دیکھا۔ کرن جہاں بیٹھ کر پڑھا کرتی تھی، وہ کھڑکی کھل رہی تھی۔ کھڑکی کھولنے والی کرن نظر آئی پھر پردہ درست کرتے وقت چھپ گئی۔ ان کے درمیان پردہ آگیا تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے آیا۔ اس نے قریب پہنچ کر اِدھر اُدھر دور تک دیکھا، کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تھا۔ اس نے...... کاغذ کو جیب سے نکال کر کھڑکی کے پردے کے ایک طرف جالی میں ہاتھ ڈال کر کاغذ اندر پھینک دیا۔

اسی وقت کرن کی ماں کی آواز سنائی دی۔ "کرن! کہاں ہو تم؟"

وہ آواز سنتے ہی تیزی سے چلتا ہوا اس کھڑکی اور اس مکان سے دور ہوتا چلا گیا۔

کرن اس وقت کمرے میں نہیں تھی۔ کھڑکی کا پردہ درست کرتے ہی کمرے سے نکل کر واش روم چلی گئی تھی۔ ماں اسے جگانے آئی تھی۔ اس کا بستر خالی دیکھ کر اسے آواز دی تھی کہ وہ کہاں گئی ہے؟

کھڑکی کا پردہ ہل رہا تھا۔ ماں کو یوں لگا جیسے کوئی کھڑکی کے باہر ہے۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس آئی۔ پردے کو ہٹا کر دیکھا۔ ذرا فاصلے پر کوئی تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ وہ اسے پہچان نہ سکی لیکن کھڑکی سے ہٹتے وقت اس کی نظر فرش پر گئی۔ وہاں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ پڑا تھا۔

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا پھر جھک کر اٹھالیا۔ اسے کھول کر اس پر ایک نظر ڈالی۔ کاغذ کی تحریر کے آغاز میں کرن کا نام تھا۔ اختتام پر رئیس الزماں کا نام پڑھ کر اس نے فوراً ہی اسے دوبارہ تہہ کر کے اپنے لباس میں چھپالیا۔ دوبارہ کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ اب کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جا چکا تھا۔ اس کی صورت دکھائی نہ دینے کے باوجود کرن کی امی سمجھ گئی کہ وہ رئیس الزماں ہی تھا۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ دروازہ بند کر کے کسی کی مداخلت کے بغیر اس تحریر کو پڑھ سکے اور جو نیا مسئلہ سامنے آرہا تھا، اس پر غور کر سکے۔ پچھلی رات اس نے بیٹی کو بتایا تھا کہ رئیس الزماں کے والدین اس کا رشتہ مانگنے آئے تھے۔ یہ سن کر وہ شرمانے اور مسکرانے لگی تھی۔

ماں نے اس سے کہا تھا۔ "تمہارا یہ انداز بتا رہا ہے کہ تم خوش ہو اور تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کی حیا اور مسکراہٹ، ایک واضح جواب تھا۔ ماں نے کہا تھا "کسی کو بیٹی دینے سے پہلے بہت کچھ دیکھا اور سمجھا جاتا ہے۔ لڑکے میں صرف ایک خوبی ہے کہ وہ بہت ذہین ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ کوئی خاندانی پس منظر نہیں ہے

اور نہ ہی کوئی سماجی حیثیت ہے۔ ہمارے خاندان کے تمام افراد پوچھیں گے کہ ہم نے کیا سوچ کر گلی گلی ٹھیلا لے کر گھومنے والے کو بیٹی دی ہے؟“

”امی! زندگی مجھے گزارنا ہے۔ خاندان والوں کو نہیں۔“

”زندگی گزارنے کے لیے خاندانی مرتبے اور باپ دادا کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ تمہارے ابا بھی بہت ذہین اور تعلیم یافتہ تھے۔ ایک بینک مینجر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ تم زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرو۔ اپنے خاندان میں کسی سے کمتر نہ رہو۔ کیا تم باپ کی خواہش کے بالکل برعکس اتنی کمتر ہونا چاہتی ہو کہ ایک ٹھیلے والے کی بیوی کہلانا چاہتی ہو۔ اپنے ساتھ ہم سب کو اس کا رشتے دار بنانا چاہتی ہو؟“

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ ہچکچاتی رہی پھر بولی۔ ”ٹھیلے پر سبزیاں رکھ کر بیچنا اس کا خاندانی پیشہ نہیں ہے اور نہ پہلے تھا۔ حالات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ زندہ رہنے کے لیے عارضی طور پر یہ پیشہ اختیار کریں۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو کر اس پیشے کو چھوڑ چکے ہیں۔“

”لیکن کہلائیں گے وہی سبزیاں بیچنے والے۔ ہم خاندان میں کس کس کو سمجھاتے پھریں گے۔ کیا بتائیں گے کہ ان کا خاندان کیا تھا؟“

”غریبی ایسی ہوتی ہے کہ خاندانی شجرے کو کھا جاتی ہے۔ نسل در نسل غریب رہنے والے صرف تین وقت کی روٹیاں یاد رکھتے ہیں۔ شجرہ بھول جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ شریف، محنتی اور ایماندار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی سچائی اور لگن سے پھر ایک نیا شجرہ بناتے ہیں۔“

”یہ بڑی بڑی کتابی باتیں ہمارے خاندان والوں کو قائل نہیں کریں گی۔ کتنے ہی رشتے دار شرم سے تعلق توڑ لیں گے یا ہم سے ایسے کترائیں گے جیسے ہمیں چھوت کی بیماری ہو۔ یہ درست ہے کہ زندگی تمہیں گزارنا ہے لیکن تم اس گھر سے ہم سب کے سر جھکا کر جاؤ گی۔ ایسے بڑے فیصلے کرتے وقت صرف اپنی ذاتی پسند کو ترجیح نہیں دی جاتی، پورے خاندان کی عزت اور وقار کو بھی بحال رکھنا پڑتا ہے۔“

یہ پچھلی رات کی باتیں تھیں۔ صبح فہیم کا وہ خط کرن کی اماں کے ہاتھ لگ گیا۔ اس

نے وہ خط پڑھ کر چھپا لیا اور کچن میں آکر ناشتہ تیار کرنے لگی۔ چھٹی کا دن تھا۔ کرن نے بھی کچن میں آکر ماں کا ہاتھ بٹایا۔ ماموں جان نے جلدی سے ناشتا کرتے ہوئے کہا۔ ”آج چھٹی ہے مگر مجھے اوور ٹائم......... کرنے کے لیے دفتر جانا ہوگا۔ جلدی سے چائے پلا دو۔ دوپہر کو چھٹی ہو جائے گی۔“

کرن نے چائے لا کر دی۔ ماموں نے اس کی ماں سے پوچھا۔ ”کیا تم نے کرن کو کل والی بات بتائی تھی؟“

”بتا چکی ہوں۔ یہ ذہنی طور پر ابھی بچی ہے۔ اس لڑکے کی صرف ذہانت سے متاثر ہے۔“

عبیدالرحمان نے چائے پیتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے ملک میں اس سے بھی زیادہ ذہین نوجوان ہیں۔ وہ بے روزگار رہتے ہیں۔ اتنی ترقی کا صرف خواب دیکھتے ہیں، جو رئیس الزماں نے حاصل کی ہے۔ وہ پڑھتا بھی ہے اور پانچ ہزار روپے ماہانہ کماتا بھی ہے۔ کیسے کماتا ہے؟ کہاں ملازمت کرتا ہے؟ کل ہم نے یہ نہیں پوچھا لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ پیٹ بھرنے کے ساتھ زیادہ کمانے کی خواہش آدمی کی ذہانت کو غلط راستوں پر لے جاتی ہے۔ ابھی میرے پاس بحث کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں اطمینان سے معلوم کروں گا کہ رئیس الزماں کس کمپنی میں کس حیثیت سے کام کرتا ہے۔“

وہ چائے پینے کے بعد اپنے دفتر چلا آیا۔ ہیڈ کلرک کے عہدے پر جب سے ترقی ہوئی تھی، تب سے وہ کبھی کبھی چھٹی کے دنوں میں بھی کام کرنے لگا تھا۔ اس طرح بڑے صاحب بھی خوش رہتے تھے اور تنخواہ کے علاوہ اوور ٹائم کی رقم بھی ملتی تھی۔ دوپہر کو دفتر بند کرنے سے پہلے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر پوچھا۔

”ہیلو، کون؟“

دوسری طرف سے کہا گیا۔ ”میرا نام ایکس وائی زیڈ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ مجھے نام سے نہیں پہچان سکیں گے۔ ویسے میں نام کا نہیں، کام کا آدمی ہوں۔ خدائی خدمت گار ہوں۔ لوگوں کو گڑھے میں گرنے سے بچاتا ہوں۔ آپ کو بھی بچانے کے لیے فون کیا ہے۔“

"آپ کچھ ڈرامائی انداز میں بات کر رہے ہیں۔ سیدھی بات بتا دیں۔"

"بات سیدھی نہیں پیچیدہ ہے۔ وہ جو سبزیاں بیچنے والا تعلیم یافتہ نوجوان ہے' اس کا نام رئیس الزماں نہیں ہے۔ دو برس پہلے اس کا کچھ اور نام تھا۔ اس نام سے بھی پہلے کوئی اور نام تھا۔ وہ بظاہر ایک ذہین اور معصوم سا نوجوان ہے لیکن نام بدل بدل کر واردات کرتا ہے اور اپنی ذہانت کو مجرمانہ انداز میں استعمال کرتا ہے۔"

"تم یقین نہ کرنے والی بات کر رہے ہو۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"تمہاری بھانجی جانتی ہے کہ وہ کس کالج میں پڑھتا ہے لیکن یہ نہیں جانتی کہ اس کالج میں اس کا نام رئیس الزماں نہیں' فہیم الزماں ہے۔ کل کالج جا کر تصدیق کر سکتے ہو۔"

فون بند ہو گیا۔ عبید الرحمان نے ہیلو ہیلو کہہ کر کریڈل کو کھٹکھٹایا مگر جواب نہیں ملا۔ وہ ریسیور رکھ کر سوچنے لگا۔ جس نے بھی فون کیا ہے' وہ رئیس الزماں سے عداوت رکھتا ہو گا۔ وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے لیکن اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے کسی کالج کا حوالہ دے رہا ہے۔ کرن اس کالج کا نام جانتی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ وہ کس نام سے وہاں تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ یہ ایسا اہم معاملہ ہے کہ اس کی تصدیق کرنی ہو گی۔

اس نے گھر آکر بہن کو فون پر ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتائی۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ "اگر وہ واقعی نام بدل بدل کر کچھ ہیرا پھیری کرتا رہتا ہے تو اس کی وجہ سے ہماری بیٹی کسی مشکل میں پڑ سکتی ہے۔"

عبید الرحمان نے کہا۔ "ابھی کرن کے سامنے پریشانی ظاہر نہ کرو۔ اس کی اصلیت معلوم کرنا چاہیے۔ میں دفتر سے غیر حاضر نہیں رہ سکتا۔ تم کرن کو ساتھ لے کر اس کے کالج میں جاؤ۔ حقیقت کیا ہے' یہ کل معلوم ہو جائے گی۔"

دوسرے دن کرن کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اس کی ماں نے کہا۔ "بیٹی! ہمیں اچھے برے کی پہچان ہونی چاہیے۔ آج میں رئیس الزماں سے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے کالج کا نام اور پتا جانتی ہو۔"

"امی! آپ اچانک اس سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟"

"میں تمہاری بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری موجودگی میں ہی اس سے چند باتیں کروں گی۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ "امی! آپ وعدہ کریں کہ اسے اپنے سے کمتر سمجھ کر بات نہیں کریں گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔ کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کروں گی۔"

اس کی ماں نے بھی لباس تبدیل کیا۔ ماں بیٹی مکان کا دروازہ مقفل کر کے بس اسٹاپ پر آئیں پھر وہاں سے کالج پہنچ گئیں۔ کرن نے کہا۔ "وہ فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ ہے۔ اپنی کلاس میں ہو گا۔ ہمیں دیکھ کر کلاس سے باہر آجائے گا۔"

وہ کلاس روم کے دروازے پر آئیں۔ وہاں اسے دیکھا۔ اندر جتنے بھی طلبہ و طالبات تھے' ان میں فہیم نظر نہیں آرہا تھا۔ پروفیسر نے دروازے پر آکر پوچھا۔ "آپ کسے تلاش کر رہی ہیں؟"

"یہاں رئیس الزماں نامی ایک اسٹوڈنٹ ہے۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔"

پروفیسر نے کہا۔ "یہاں رئیس الزماں نام کا کوئی اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔"

کرن نے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے یہاں داخلہ لیا ہے اور باقاعدگی سے پڑھنے آتا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹی! تمہیں کچھ مغالطہ ہو رہا ہے۔ شاید وہ کسی دوسرے کالج میں ہو۔"

"امی! میں اچھی طرح جانتی ہوں' اس نے اسی کالج میں داخلہ لیا ہے۔ آئیے پرنسپل صاحب سے معلوم کریں۔"

جب بورڈ کا امتحان ہوا تھا تو فہیم پورے صوبے میں اول آیا تھا۔ اس کالج کے پرنسپل نے بڑے فخر سے اسے اپنے کالج میں خوش آمدید کہا تھا۔ وہاں کے تمام اسٹوڈنٹس اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ تمام پروفیسر اس کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ اس قدر مشہور و معروف ہونے کے باوجود نام کے حوالے سے کالج میں گمنام تھا۔

فہیم اس وقت پرنسپل کے کمرے میں تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ "ہمارے کالج میں

کئی ذہین طالب علم ہیں۔ میں کالج کی شہرت اور نیک نامی کے لیے چاہتا ہوں کہ تم تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ و طالبات کو کبھی کبھی گائیڈ کرتے رہو۔ جتنے اسٹوڈنٹس اچھے مارکس اور اچھی پوزیشن حاصل کریں گے اتنی ہی ہمارے کالج کو شہرت اور مقبولیت حاصل ہو گی۔"

فہیم نے کہا۔ "سر! میں بہت مصروف رہتا ہوں اس لیے کالج ٹائم میں ہی یہاں کے اسٹوڈنٹس کو اٹینڈ کر سکتا ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ کسی بھی فری پیریڈ میں ان پر ذرا توجہ دے دیا کرو۔"

پرنسپل نے ایسا کہتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ دونوں ماں بیٹی وہاں کھڑی ہوئی تھیں۔ فہیم کی پشت ان کی طرف تھی۔ وہ پرنسپل کی طرف متوجہ تھا۔ پرنسپل نے ان سے پوچھا۔ "فرمایئے؟"

کرن نے کہا۔ "میں یہاں کے ایک اسٹوڈنٹ رئیس الزماں سے ملنے آئی ہوں۔ وہ فرسٹ ائیر کا اسٹوڈنٹ ہے۔"

کرن کی آواز نے فہیم کو چونکا دیا۔ فوراً دماغ میں یہ بات آئی کہ پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہیے۔ نظریں ملیں گی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ وہ پریشان ہو گیا کہ کرن کبھی اپنے کالج کے وقت نہیں آئی۔ آج کیسے آ گئی؟ کیا واقعی یہ کرن کی آواز آئی ہے؟ کیا واقعی کرن تھی؟ کیا مجھے پلٹ کر دیکھنا چاہیے؟

پرنسپل نے کہا۔ "آپ فرسٹ ائیر کی کلاس میں جا کر دیکھیں۔ مجھے نئے اسٹوڈنٹس کے نام یاد نہیں ہیں۔" پھر وہ فہیم سے بولا۔ "فہیم، تمہیں تو پتا ہو گا۔ تمہاری کلاس میں رئیس الزماں نامی کوئی لڑکا آیا ہے؟"

وہ ہچکچایا۔ کالج میں رئیس الزماں آیا ہے یا نہیں؟ اسے زبان سے جواب دینا چاہیے تھا لیکن اس نے انکار میں سر ہلایا، یعنی وہ جسے تلاش کرنے آئی ہے، وہ آج نہیں آیا ہے۔

کرن واپس جانے کے لیے پلٹنا چاہتی تھی۔ ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ کل اس کے بھائی عبیدالرحمان کو فون پر کسی نے کہا تھا۔ "تمہاری بھانجی یہ نہیں جانتی کہ اس کالج میں اس کا نام رئیس الزماں نہیں، فہیم الزماں ہے۔" اور پرنسپل نے سامنے بیٹھے

ہوئے لڑکے کو فہیم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

اس کی ماں نے کہا۔ "آج رئیس نہیں آیا، کوئی بات نہیں۔ کیا میں فہیم سے دو باتیں کر سکتی ہوں؟"

فہیم کے ہوش اڑ گئے۔ پرنسپل نے کہا۔ "بے شک آپ باتیں کریں۔ فہیم تم جا سکتے ہو۔"

اب تو اسے وہاں سے اٹھنا تھا اور پلٹ کر جاتے وقت اپنا منہ دکھانا تھا۔ اس سے پہلے ہی کرن ماں سے ہاتھ چھڑا کر جانے لگی۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ماں کے ساتھ دفتر کے دروازے پر پہنچتے ہی فہیم کو اس کی پشت سے پہچان گئی تھی۔ وہ محبوبہ ہی کیا جو اپنے محبوب کے روئیں روئیں نہ پہچانے؟

جب کرن نے دیکھا کہ فہیم کترا رہا ہے اور یوں کترانے کے پیچھے کوئی بات ہو سکتی ہے تو وہ ایسے انجان بن گئی جیسے اپنے محبوب رئیس الزماں کو نہیں پہچان رہی ہو۔ اس نے سوچا تھا کہ تنہائی میں رئیس سے پوچھے گی کہ پرنسپل کے دفتر میں اس سے کیوں کترا رہا تھا۔

وہ ماں سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے برآمدے میں چل دی تھی۔ ماں نے پیچھے آتے ہوئے کہا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ رک جاؤ۔ تم جسے رئیس الزماں کہتی ہو، میں اس کی اصلیت تمہیں دکھانے لائی ہوں۔ اس کالج میں اس کا نام فہیم الزماں ہے۔ ابھی وہ ہم سے منہ چھپائے پرنسپل کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں کہتی ہوں رُک جاؤ۔ اس رئیس یا فہیم سے مجھے دو باتیں کرنے دو۔"

وہ برآمدے سے اتر کر درختوں کے سائے میں آ کر رک گئی پھر بولی۔ "امی! آپ نے ابو سے بہت محبت کی ہو گی۔ اتنی محبت کہ وہ آپ سے جان بھی مانگتے تو آپ دے دیتیں۔"

"بے شک میں تمہارے ابو کے ایک اشارے پر جان دے دیتی۔ ہمارے زمانے کی محبت اب کہیں نظر نہیں آتی۔"

"امی! زمانے بدل جاتے ہیں، محبت نہیں بدلتی۔ محبت میں جان دینا بڑی بات نہیں

ہے۔ اپنے چاہنے والے کی عزت رکھنا بڑی بات ہے۔ اگر میں پرنسپل کے دروازے پر رک جاتی تو آپ وہیں رئیس الزماں کی توہین کرنے لگتیں۔ اس کا نام فہیم ہو سکتا ہے' فہیم کے علاوہ اس کے دوسرے نام بھی ہو سکتے ہیں۔ اس میں وہ برائیاں بھی ہو سکتی ہیں لیکن وہ ذہانت اور عملی صلاحیتوں کے حوالے سے قابلِ فخر ہے اور ابھی ایک درس گاہ میں ہے۔ آپ اس کے منفی اعمال کا حساب اس کے گھر جا کر بھی دے سکتی ہیں لیکن یہاں تو ذہانت اور علم کا بھرم رکھنا چاہیے۔"

ماں نے سر جھکا لیا۔ مسجد اور درس گاہ دو ایسے مقامات ہیں جہاں کسی پر کیچڑ نہیں اچھالنا چاہیے۔ وہ خاموشی سے بیٹی کے ساتھ جانے لگی۔

فہیم پرنسپل کے کمرے سے نکل کر آیا تھا۔ اسے تو اب کرن کا سامنا کرنا ہی تھا۔ وہ برآمدے میں آیا تو ماں بیٹی ایک دوسرے کے آگے پیچھے جا رہی تھیں۔ ماں اسے رکنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ برآمدے سے اتر کر درختوں کے سائے میں آ کر رک گئی تھی۔ فہیم ایک مجرم کی طرح چلتا ہوا ایک درخت کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔ ان ماں بیٹی کی باتیں سنتا رہا تھا لیکن ان کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

اگرچہ کرن نے اس کے بارے میں کسی حد تک حوصلہ افزا باتیں کی تھیں لیکن اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ کالج کے باہر رئیس (فہیم) کے گھر میں یا تنہائی میں اس کا محاسبہ کرے گی۔

اور یہ تو صرف کرن کی بات تھی لیکن اس کے بزرگ بھی بڑی سختی سے اس کا محاسبہ کرنے والے تھے۔ وہ پہلے ہی ایک سبزی فروش کو بیٹی دینے کے خلاف تھے۔ اب تو اور بھی آسانی سے انکار کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔

وہ ان ماں بیٹی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو اس نے لائبریری میں آ کر فون کے ذریعے بدیع الزماں سے رابطہ کیا پھر کہا۔ "میرے خلاف سازش ہو رہی ہے۔ ابھی کرن اپنی ماں کے ساتھ میرے کالج آئی تھی۔ کسی نے اسے بتا دیا ہے کہ میرا اصلی نام رئیس الزماں نہیں' فہیم الزماں ہے۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "تعجب ہے۔ ایسی بات انہیں کون بتا سکتا ہے؟"

"دو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ راز میرے اور آپ کے گھر کے درمیان محفوظ رہا ہے۔ اب یہ راز کرن کے گھر تک پہنچ گیا ہے اور اس وقت پہنچا ہے جب آپ کے صاحب زادے سے کرن کے معاملے میں میری مخالفت شروع ہوئی ہے۔"

"تم خواہ مخواہ میرے بیٹے کو اس معاملے میں لپیٹ رہے ہو۔ میں تمہارے اور اپنے بیٹے کے درمیان صلح صفائی کرا چکا ہوں۔ وہ اتنا نادان نہیں کہ کرن کو اہمیت دے کر ہمارے ان تعلقات کو خراب کرے گا جو برسوں تک قائم رہنے والے ہیں۔ تم اس معاملے کو مختلف پہلوؤں سے سوچو۔ کسی تیسرے کو ہمارے خفیہ معاملات کا پتا چل گیا ہے اور وہ ہمارے درمیان دیوار بن رہا ہے۔"

"جناب! میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔"

"میرے کئی دشمن ہیں۔ وہ ایسی سازشیں کر سکتے ہیں۔ ایسا کرو کہ میں ایک گھنٹے بعد لیاقت لائبریری جا رہا ہوں۔ تم وہاں چلے آؤ' ہم وہاں اطمینان سے باتیں کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔ مجھے بھی لائبریری میں ضروری کتابوں کی اسٹڈی کرنی ہے۔ میں ابھی وہاں جا رہا ہوں۔ جب تک آپ نہیں آئیں گے' وہاں پڑھتا رہوں گا۔"

رابطہ منقطع ہو گیا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد لائبریری پہنچا۔ وہاں ہال میں چھت اور دیواروں کی مرمت ہو رہی تھی۔ دوسری جگہ بیٹھ کر پڑھنے کے لیے کتابیں جاری نہیں کی جا رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک گیٹ پر کھڑا رہا پھر بدیع الزماں کو فون کیا۔ وہ گھر سے جا چکا تھا لیکن دو گھنٹے گزرنے کے بعد بھی وہ وہاں نہیں آیا۔

فہیم نے پھر کوٹھی میں فون کیا' سیکریٹری نے کہا۔ "صاحب کا فون آیا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ لیاقت لائبریری بند ہے تو وہ کلفٹن چلے گئے۔ وہاں چار بجے پلے لینڈ کے ریستوران میں ملیں گے۔"

فہیم نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے والے تھے۔ وہ بسیں بدل بدل کر اس ریستوران میں پہنچا تو پانچ بج چکے تھے۔ بدیع الزماں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اس کا انتظار کر کے چلا گیا تھا پھر بھی اس نے انتظار کیا پھر پریشان ہو کر ساحل سمندر پر آ گیا۔ وہاں بیٹھ کر اپنے حالات

پر غور کرنے لگا۔ "پتا نہیں کرن کو اور اس کے بزرگوں کو میرے بارے میں کیا کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ ویسے انہیں ایک بات تو معلوم ہو گئی کہ کالج میں میرا نام رئیس الزماں نہیں ہے اور میرا نام فہیم الزماں کیوں ہے' یہ بتانے کے لیے مجھے اندر کی بہت سی باتیں بتانی ہوں گی۔ ہو سکتا ہے جس نے یہ بھید کھولا ہو' اس نے بہت کچھ بتا دیا ہو۔"

رات کی تاریکی پھیل گئی تھی۔ وہ ساحل پر بیٹھا سوچتا رہا۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ کتنا وقت گزر چکا ہے۔ جب وہ بس میں بیٹھ کر اپنے علاقے میں پہنچا تو گیارہ بج رہے تھے۔ ماں باپ نے پوچھا۔ "بیٹا! اتنی دیر کہاں رہ گئے تھے؟"

وہ بولا۔ "کیا بتاؤں ابا! معاملہ الجھ گیا ہے۔ آگے اور الجھنے والا ہے؟"

"آخر بات کیا ہے بیٹے؟"

"کسی نے کرن کے گھر والوں کو بتا دیا ہے کہ میرا نام رئیس الزماں نہیں ہے۔ اب اس کی ماں اور ماموں مجھے جھوٹا اور دھوکے باز سمجھ رہے ہوں گے۔"

ماں نے اس کے لیے سالن گرم کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ تو پہلے ہی ٹال رہے تھے۔ اب کبھی بھی اپنی بیٹی نہیں دیں گے۔"

باپ نے کہا۔ "تم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ایک بڑے باپ کے بیٹے کو امتحان پاس کرانے کے لیے اپنا نام تبدیل کیا ہے۔ کسی کو دھوکا دے کر نقصان نہیں پہنچایا ہے۔"

"ابا! تم نہیں سمجھو گے.......... میں نے جرم کیا ہے۔ محکمۂ تعلیم سے فراڈ کیا ہے۔ ہمارے ملک کے کئی شعبوں کی کارکردگی اس لیے ناقص ہے اور اہم منصوبے اس لیے ناکام ہوتے ہیں کہ ہم اپنی ذہانت اور اپنا علم بیچ کر نا اہل افراد کو کسی بھی شعبے کا اہل بنا دیتے ہیں۔"

ماں نے روٹی سالن لا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "آدمی مجبور ہو جائے تو اور کیا کرے؟ تم ایسا نہ کرتے تو ناجو سہاگن کیسے بنتی؟ تمہارے باپ کی بیماری کیسے دور ہوتی؟ اور تم اتنا آگے کیسے پڑھ پاتے؟ پہلے ٹین کی چھت سے پانی ٹپکتا تھا۔ اب چھت مجبوط ہو گئی ہے۔"

"دنیا کا ہر چور اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے چوری کرتا ہے۔ ہم بھی اپنی

ضرورتیں پوری کرتے وقت جائز اور ناجائز کے فرق کو سمجھنا ضروری نہیں سمجھتے ہیں"

باپ نے کہا۔ "تم کھد سوچو' ناجائز طریکے سے ہمارے کتنے بڑے بڑے کام ہو گئے۔ بس ایک کام رہ گیا' تم جسے ہماری بہو بنانا چاہتے ہو' وہ لوگ ہم کو اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں جب کہ تم پانچ ہجار کماتے ہو۔"

"میں ایسے ناجائز طریقے سے پانچ لاکھ پانچ کروڑ........... کماؤں تب بھی دال روٹی کھانے والے سے کمتر رہوں گا۔ عالیشان کوٹھیوں اور کاروں والے برتر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کاریں ہم پر کیچڑ اچھالتی ہوئی گزر جاتی ہیں حالانکہ وہ خود......... اندر سے کتنے غلیظ ہوتے ہیں۔ آج مجھے اپنے اندر کی کیچڑ دکھائی دے رہی ہے۔"

وہ کھانے کے بعد ہاتھ منہ دھونے اور کلیاں کرنے لگا۔ تولیے سے منہ پونچھتے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ سب نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ صابرہ نے کہا۔ "آدھی رات ہو چکی ہے اس وکت کون آیا ہے؟"

فہیم نے آنگن کے دروازے پر آ کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی۔ "پولیس' دروازہ کھولو۔"

اس کے ماں باپ بھی آنگن میں آ گئے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر پولیس کی وین کھڑی ہوئی تھی۔ کئی مسلح سپاہی تھے۔ ایک افسر بھی تھا' اس نے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"رئیس الزماں۔"

"اور تمہارے کتنے نام ہیں؟"

"میرا دوسرا نام فہیم الزماں ہے اور یہ میرا پیدائشی نام ہے۔ ان دو کے سوا کوئی تیسرا نام نہیں ہے۔"

"لڑکی کہاں ہے؟"

"کون لڑکی؟"

"وہی کرن خورشید جو آج تمہارے کالج گئی تھی۔"

"گئی ہو گی لیکن مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"چلو' گاڑی میں بیٹھو۔"

"آپ میرے بیٹے کو کہاں لے جا رہے ہیں۔"

افسر نے کہا۔ "بڑے صاحب! فکر نہ کرو۔ تھانے تفتیش کے لیے لے جا رہے ہیں۔ اغوا کا کیس ہے۔"

ایک زنانہ پولیس والی صابرہ کے ساتھ مکان کے اندر آئی اور مکان کے ہر حصے میں یہ دیکھنے لگی کہ کسی لڑکی کو کہیں چھپا رکھا گیا ہے یا نہیں؟ فہیم نے پریشان ہو کر پوچھا "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کرن خورشید کو اغوا کر لیا گیا ہے؟"

"ہاں وہ تمہارے کالج گئی تھی' اس کے بعد گھر واپس نہیں آئی۔"

فہیم اندر سے تڑپ گیا۔ اس نے کہا۔ "مجھے ایک اسٹوڈنٹ نے بتایا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے ساتھ آئی تھی۔ کیا وہ اپنی والدہ کے ساتھ واپس نہیں گئی تھی؟"

"اس کی والدہ کا بیان ہے کہ وہ تمہارے کالج سے بس اسٹاپ تک آئی پھر اپنے کالج کے لیے ایک بس میں بیٹھ گئی۔ اس کی والدہ دوسری بس میں گھر چلی آئی۔"

لیڈی کانسٹیبل نے آ کر کہا۔ "سر! اندر کوئی نہیں ہے۔"

افسر نے کہا۔ "تمہیں احتیاطاً تلاشی لینے کے لیے بھیجا تھا۔ ویسے ہم جانتے ہیں کہ چور' چوری کا مال اپنے گھروں میں نہیں چھپاتا۔"

"سر! آپ مجھ پر شبہ کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اصل مجرم آپ کو ضرور ملیں گے۔ چلیے' میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

تھانے میں کرن کی ماں اور اس کا ماموں عبیدالرحمان بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے فہیم کو دیکھتے ہی پولیس انسپکٹر سے پوچھا۔ "کیا ہماری بیٹی مل گئی؟"

"نہیں' اس کے گھر میں نہیں ہے۔"

عبیدالرحمان نے کہا۔ "اس نے کسی دوسری جگہ اسے چھپایا ہو گا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اتنی عقل ہمیں بھی ہے۔ جب تک کوئی سوال نہ کروں' آپ اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں۔"

پھر انسپکٹر نے کرن کی ماں سے کہا۔ "یہ کہتا ہے کہ اس نے کرن کو اپنے کالج میں

نہیں دیکھا تھا۔ ایک اسٹوڈنٹ نے اسے بتایا کہ وہ وہاں گئی تھی۔"

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ پرنسپل کے کمرے میں تھا اور ہم سے منہ چھپا رہا تھا۔ آپ اس کالج کے پرنسپل سے پوچھ سکتے ہیں۔"

انسپکٹر نے فہیم سے کہا۔ "پرنسپل سے کل پوچھا جائے گا' تم کیا کہتے ہو؟"

"میں نے یہ سچ کہا کہ ایک اسٹوڈنٹ نے کرن کی آمد کے بارے میں مجھے بتایا تھا اور آنٹی کا یہ بیان درست ہے کہ میں پرنسپل کے دفتر میں تھا۔ ان ماں بیٹی سے منہ کیوں چھپا رہا تھا' یہ کرن سمجھتی تھی اور اس نے آنٹی کو سمجھایا تھا کہ انہیں کالج میں مجھ سے نہیں ملنا چاہیے۔ میرے گھر آ کر میرے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیے۔"

"کیسی معلومات؟"

"یہی کہ میرے دو نام کیوں ہیں؟"

"کیوں ہیں تمہارے دو نام؟"

"سر! یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ گھر میں کسی نام سے پکارا جاتا ہے اور باہر کوئی اور نام ہوتا ہے۔ دلیپ کمار کا پیدائشی نام یوسف خان ہے اور ندیم کا پیدائشی نام نذیر بیگ ہے۔ ایسی درجنوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ اکثر لوگ اپنی جنم کنڈلی اور علم نجوم کی روشنی میں نام تبدیل کرتے ہیں پہلا نام بھی اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔"

کرن کی ماں نے پوچھا۔ "تم نے کرن سے اپنا پیدائشی نام کیوں چھپایا تھا؟"

"اللہ جانتا ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ فہیم الزماں میرا پیدائشی نام ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "میں نے تمہارے بارے میں سنا ہے تم بہت تیز ہو اور غیر معمولی ذہانت کے حامل ہو۔ تمہارے پاس فہیم الزماں اور رئیس الزماں کے ناموں سے دو شناختی کارڈ ہیں اور دو الگ ناموں کے کاغذات وغیرہ ہیں اور یہ سب غیر قانونی ہے۔ مسٹر عبیدالرحمان کو فون پر بتایا گیا ہے کہ تم مختلف ناموں سے واردات کرتے ہو۔"

"میرے کسی دشمن نے فون پر ایسا کہا ہے ورنہ میں نے کوئی واردات کی ہے اور نہ میرے خلاف کوئی ثبوت اور گواہ ہے۔ کسی نے فون پر انکل کو میرے خلاف بہکایا ہے اور دوسری طرف کرن کو اغوا کیا ہے۔ میرے خلاف سازش کی جا رہی ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ تمہارے جرم کا تحریری ثبوت موجود ہے۔"

فہیم نے حیرانی سے پوچھا۔ "تحریری ثبوت؟"

کرن کی ماں نے کہا۔ "ہاں' جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ہم کرن کی شادی تم سے نہیں کریں گے تو تم نے کرن کو ایک خط لکھ کر اس کے کمرے کی کھڑکی سے اندر پھینکا تھا۔ وہ خط میں نے اٹھایا تھا۔ اس میں تم نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ کرن سے شادی نہ ہوئی تو تم اسے بھگا کر لے جاؤ گے۔"

فہیم سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پریشانی کی حالت میں بے چین ہو کر یونہی جذباتی انداز میں لکھ دیا تھا کہ کرن کو بھگا کر لے جائے گا۔ جب کہ اس جیسا ذہین اور سنجیدہ جوان ایسی مجرمانہ حرکت نہ کر سکتا تھا اور نہ ہی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

انسپکٹر نے ایک کاغذ فہیم کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی ہے۔ اصل خط عدالت میں پیش ہو گا۔ تم نے تحریری طور پر اسے اغوا کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ کیا اپنی تحریر سے انکار کرو گے؟"

"سر! آپ میری اس تحریر سے میری ذہنی پریشانیوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں نے محض پریشانی کی حالت میں ایسا لکھا تھا۔"

"ذہنی پریشانی آدمی کو ابنارمل بنا دیتی ہے۔ اس خط سے تمہارے ابنارمل ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔"

پھر اس نے اپنے ماتحت سے کہا۔ "اسے حوالات میں ڈال دو۔ اگر یہ صبح تک اپنے جرم کا اقرار نہیں کرے گا تو پھر ڈنڈے کھا کر لڑکی یہاں لائے گا۔"

صابرہ رو کر کہنے لگی۔ "میرا بیٹا بے کسور ہے۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں' اس پر جلم نہ کریں۔ میرے بیٹے کو چھوڑ دیں۔ اس نے کرن کو اگوا نہیں کیا ہے۔"

فہیم کے والدین روتے اور التجا کرتے رہے۔ سپاہیوں نے اسے دھکا دے کر حوالات میں بند کر دیا۔ امتحان ہال میں بیٹھ کر اپنی ذہانت سے صوبہ بھر میں اول آنے والا حوالات میں بیٹھ کر سوچنے لگا۔ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے؟ وہ اپنے سے زیادہ کرن کے بارے میں سوچ

رہا تھا کہ کس نے اسے ہاتھ لگایا ہے؟ اسے کہاں پہنچایا گیا ہے؟ یا اللہ! اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہو گا؟"

اس کے ذہن میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ اس بڑے باپ کے بیٹے رئیس الزماں نے ایسی حرکت کی ہو گی۔ کرن نے اسے لفٹ نہیں دی تھی اور اپنی توہین محسوس کر کے ایسا کیا ہو گا۔ بڑے باپ کی بگڑی ہوئی اولاد کچھ بھی کر سکتی ہے۔

اس نے سوچا۔ "میں بہت ذہین کہلاتا ہوں پھر اتنی سی بات سمجھ میں کیوں نہیں آئی کہ غلط کام کا نتیجہ غلط ہو گا۔ کیا اپنی غلطی کا اعتراف کیا جائے کہ ہمارے ملک میں ایسا چکلا بھی ہے' جہاں اپنی ذہانت کی آبرو لٹائی جاتی ہے اور نااہل کو اہل ثابت کر کے تعلیم کی نفی کی جاتی ہے۔"

یہ درست ہے کہ بہن سہاگن بن جاتی ہے۔ باپ تندرست ہو جاتا ہے۔ نصیب تھوڑا سا سنور جاتا ہے لیکن اس طرح ذہانت خرید کر نااہل افراد حکومت کی مشینری کے اہم پرزے بن جاتے ہیں۔ پچھلے پچاس برسوں سے کسی بااقتدار سیاست داں کی اولاد ناکام نہیں ہوئی' ہمیشہ اونچی پوزیشن حاصل کر کے سیاسی وارث بنتی رہی۔ جس ممتحن' پروفیسر اور پرنسپل نے انہیں نااہلی کی سند دینا چاہی' اس بیچارے کی چھٹی کر دی گئی۔

اس کے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آ رہی تھیں۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ "میرے ایسا سوچتے رہنے سے کیا ہو گا؟ کرن کا کیا بھلا ہو گا؟ اس کا سراغ کیسے ملے گا؟ کیسے معلوم ہو گا کہ کون اسے لے گیا ہے؟ اور کہاں لے گیا ہے؟ یہ لوگ میرے ساتھ جیسا بھی سلوک کریں' وہ تو واپس چلی آئے۔"

صابرہ ہاتھ جوڑ کر کرن کی ماں کے آگے گڑگڑاتی رہی۔ اسے یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی کہ فہیم کبھی ایسا جرم نہیں کر سکتا لیکن اس کے لکھے ہوئے خط میں جو دیوانگی تھی' وہ صاف طور سے اسے مجرم بنا رہی تھی۔

کرن کی ماں نے کہا۔ "مجھے تمہارے بیٹے سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ دنیا سچ کہتی ہے کہ چھوٹے لوگ چھوٹی اور گری ہوئی حرکتیں ضرور کرتے ہیں۔ میری بیٹی مجھے واپس مل جائے تو میں بھی تمہارے بیٹے کا جرم معاف کر دوں گی۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "چور آخری حد تک معصوم نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔ چوری کا مال آسانی سے واپس نہیں کرتا ہے۔ ایسا کرنے سے اس کی پچھلی چوریوں کا بھید کھل جاتا ہے۔ اس کا بیٹا آسانی سے نہیں بتائے گا کہ وہ کیوں نام بدل بدل کر کیسی کیسی وارداتیں کرتا رہا ہے۔"

باپ نے کہا۔ "ہمارا اللہ گواہ ہے۔ ہم نے اپنا نصیب بدلنے کے لیے بیٹے کا نام بدلا تھا۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "ہاں دیکھ لو' کیسے نصیب بدل رہے ہیں۔ جاؤ یہاں سے اور اس کی ضمانت کا بندوبست کرو۔ کسی بڑے آدمی کی ضمانت نہیں ہو گی تو یہاں تمہارے بیٹے کی ہڈیاں پسلیاں سلامت نہیں رہیں گی۔"

ان کے لیے بڑا آدمی بدیع الزماں تھا۔ اسی نے اس کے بیٹے کا نام بدلا تھا اور نصیب بدلے تھے۔ رات کے تین بجے تھے۔ وہ میاں بیوی تھانے سے باہر آئے۔ اس وقت کوئی گاڑی نہیں مل سکتی تھی۔ بدیع الزماں کی کوٹھی وہاں سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ وہ دونوں بوڑھے اتنی دور پیدل نہیں جاسکتے تھے لیکن بیٹے کے لیے بدحواس تھے۔ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ شاید آگے جا کر انہیں رکشا یا ٹیکسی مل جاتے مگر نہیں ملے۔ نصیب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بنتے ہیں تو عیش کراتے ہیں' بگڑتے ہیں تو فٹ پاتھ پر ہانپتے کانپتے چلنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

پتا نہیں کتنے کلومیٹر چلنے کے بعد ایک رکشا ملا۔ اس نے میٹر سے دس روپے زیادہ لیے اور انہیں منزل تک پہنچا دیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ سیکیورٹی گارڈز نے انہیں اندر جانے سے روکا۔ انہیں ایک گھنٹے تک باہر بٹھایا گیا پھر انہیں کوٹھی کے اندر بلایا گیا۔ بدیع الزماں نے پوچھا "کیا بات ہے۔ اتنی صبح کیوں آئے ہو؟"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رونے لگے۔ باپ نے کہا۔ "پولیس والے ہمارے بیٹے کو لے گئے ہیں۔ اسے حوالات میں بند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نے ایک لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارا بیٹا کتنا بھولا بھالا ہے۔ وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"ہمارے جاننے سے کیا ہوتا ہے۔ پولیس والوں کو یقین ہونا چاہیے کہ وہ ایک

شریف نوجوان ہے۔ ویسے لڑکی کون ہے؟ کیا نام ہے؟"

وہ کرن کے متعلق بتانے لگا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "اب سمجھا' تمہارے بیٹے نے اُس لڑکی کے لیے میرے بیٹے سے جھگڑا کیا تھا۔ جس تھالی میں کھاتا رہا' اسی میں چھید کرتا رہا تھا۔"

"جناب عالی! اسے نادان سمجھ کر ماپھ کر دیں۔ تھانیدار کہتا ہے' جب تک بڑا آدمی ضمانت نہیں دے گا' اسے چھوڑا نہیں جائے گا۔ اسے بہت مارا جائے گا حجور! اسے بچا لیجیے۔"

"اسے جتنا بھی مارا جائے گا' وہ ٹوٹ پھوٹ کر بھی زندہ رہے گا لیکن اس نے تو میرے بیٹے کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اگر وہ اسے قتل کر دیتا تو میرا بیٹا مجھے زندہ نہیں ملتا۔"

"مائی باپ! ہم نمک حرام نہیں ہیں۔ ہم اسے حوالات سے سیدھے یہاں لا کر آپ کے کدموں میں ڈال دیں گے' وہ آپ کے بیٹے سے ماپھی مانگے گا۔ ساری جندگی آپ کی گلامی کرتا رہے گا۔"

بوڑھے نے علاقے اور تھانے دار کا پتا بتایا۔ اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہاں میں وہاں کا فون نمبر جانتا ہوں۔ ابھی معلوم کرتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے اور میری ضمانت قبول ہو گی یا نہیں؟"

اس نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے پھر رابطہ قائم ہونے پر بولا۔ "بدیع الزماں بول رہا ہوں۔ انسپکٹر سکندر بخت سے بات کراؤ۔"

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر کی آواز سنائی دی۔ بدیع الزماں نے اس بار انگریزی زبان میں کہا۔ "اس جوان کے ماں باپ میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ ہماری باتیں سمجھیں۔ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئے ہو؟"

"جناب! ہم ایسے کام میں دیر نہیں کرتے۔ اس کی اچھی طرح دھلائی ہو رہی ہے۔"

"کیا اس معاملے میں وہ میرا نام لے رہا ہے؟"

"نہیں وہ جوان نام بدلنے کے سلسلے میں گول مول باتیں کر رہا ہے لیکن آپ کا نام نہیں لے رہا ہے۔ آپ کا نمک حلال ہے۔"

"میرے بیٹے کو قتل کرنے کی دھمکی دے کر اس نے میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی' جو زیادہ نمک حلال اور وفادار ہوتے ہیں' وہ بغاوت پر اتر آئیں تو مشکلات پیدا کر دیتے ہیں۔"

"آپ حکم کریں۔ اس کا کیا کیا جائے؟"

"اسے بالکل اپاہج بنا دو۔ یہ میرے محتاج رہیں' عدالت تک جانے اور مقدمات بھگتنے کے لیے ان کے پاس رقم نہیں ہے۔ میں شام کو اس کی ضمانت لینے آؤں گا۔ رہائی کے وقت اس کی حالت ایسی ہو کہ وہ مہینوں بستر سے نہ اٹھے اور جب اٹھے تو گھسٹ گھسٹ کر چلے۔"

"جو حکم جناب! یہی ہو گا۔"

رابطہ ختم ہو گیا لیکن بدیع الزماں نے ریسیور کان سے لگائے رکھا۔ اس بار قومی زبان میں بولا۔ "ایک لاکھ روپے تو بہت ہوتے ہیں۔ یہ بیچارے غریب ہیں۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائیں گے۔ آپ کچھ مہربانی کریں۔"

وہ ذرا خاموش ہوا پھر بولا۔ "اچھا تو ٹھیک ہے۔ اگر آپ یقین دلاتے ہیں کہ یہ کیس بالکل ختم ہو جائے گا اور ان کے بیٹے پر کوئی الزام نہیں آئے گا تو میں اپنی طرف سے ایک لاکھ روپے دے دوں گا۔ جی' جی ہاں میں ابھی رقم لے کر آؤں گا۔ کیا؟ ابھی نہیں؟ شام کو؟"

وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد بولا۔ "مجبوری ہے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔ میں شام کو ایک لاکھ روپے لے آؤں گا۔"

اس نے ریسیور رکھ دیا۔ بوڑھا آگے جھک کر اس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ دونوں میاں بیوی اسے دعائیں دینے لگے۔ حالانکہ بدیع الزماں اپنی تجوری سے ایک پیسہ خرچ نہیں کر رہا تھا۔ فہیم کے ذریعے جو پانچ لاکھ روپے کی شرط جیتی تھی وہی رقم وہ ماہانہ پانچ ہزار روپے اور اس کی بہن کی شادی کے لیے پچیس ہزار دے کر احسانات کا بوجھ ڈالتا جا

رہا تھا۔ انسپکٹر سکندر بخت سے جو کام لے رہا تھا' اس کے عوض اسے پچاس ہزار دے چکا تھا۔

☆=========☆=========☆

تھانے کے پچھلے حصے میں ایک کمرے کو عقوبت خانہ بنایا ہوا تھا' جہاں ملزمان پر تشدد کر کے ان سے اقرارِ جرم کرایا جاتا تھا۔ اس کمرے میں فہیم کو چھت سے الٹا لٹکا کر وہ بڑی درندگی سے اس کی پٹائی کر رہے تھے۔ جسم پر اتنے ڈنڈے مارے گئے تھے کہ تمام ہڈیاں چٹخنے لگی تھیں۔ چہرے پر اتنے مکے رسید کئے تھے کہ چہرہ سوج گیا تھا۔ سامنے کے دو دانت ٹوٹ گئے تھے۔ وہ لہولہان ہو رہا تھا جبکہ کسی ملزم پر ایسا تشدد نہیں کیا جاتا کہ وہ لہولہان ہو جائے اور عدالت میں پہنچ کر ظاہری طور پر زخمی نظر آئے۔ بدیع الزماں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ فہیم اور اس کے والدین کے مالی حالات انہیں آئندہ تھانے کچہری جانے کی اجازت نہیں دیں گے اور نہ ہی وہ انہیں مالی امداد دیا کرے گا۔ اس لیے انہوں نے بڑی بے دردی سے اس بیچارے کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

کرن کی ماں اور ماموں اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ ان کی کرن کے اغوا کے پیچھے بدیع الزماں کا ہاتھ ہے۔ وہ فہیم کو ناکارہ بنا دینا چاہتا تھا اور اس کے بیٹے رئیس الزماں کو کرن میں دلچسپی تھی۔ بدیع الزماں کو یہ منظور نہیں تھا کہ اس کا بیٹا کرن کو حاصل کرنے کی دوڑ میں پیچھے رہے۔ بیٹے کو آگے رکھنے کے لیے کرن کو اغوا کرانا ضروری تھا۔ ورنہ وہ فہیم کو ترجیح دے رہی تھی۔

بدیع الزماں کا پلڑا اس لیے بھی بھاری تھا کہ کرن کی ماں نے فہیم کے لکھے ہوئے خط کی فوٹو اسٹیٹ کاپی تھانے میں دی تھی۔ اس طرح فہیم کے خلاف اغوا کا کیس اور مستحکم ہو گیا تھا۔ عبید الرحمان نے بہن کو مشورہ دیا۔ "ہمیں فہیم کے پرنسپل کے پاس جا کر اپنی کرن کے اغوا کی بات بتانا چاہیے تاکہ پولیس والوں کو تفتیش کے وقت پرنسپل بھی گواہی دے کہ وہ ماں بیٹی کی آمد کے وقت دفتر میں موجود تھا۔"

وہ نہیں جانتے تھے کہ بدیع الزماں شام تک فہیم کو رہائی دلوانے والا ہے۔ وہ بھائی بہن پرنسپل کے پاس پہنچ گئے۔ کرن کی ماں نے کہا۔ "آپ کو یاد ہو گا' میں اپنی بیٹی کے

ساتھ یہاں آئی تھی اور ایک اسٹوڈنٹ رئیس الزماں کے بارے میں آپ سے پوچھا تھا۔"

پرنسپل نے کہا۔ "جی ہاں۔ مجھے یاد ہے۔ کیا رئیس الزماں نہیں ملا؟"

"اس وقت وہ آپ کے سامنے ہی بیٹھا ہوا ہم سے منہ چھپا رہا تھا۔"

"محترمہ! آپ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے سامنے تو فہیم الزماں بیٹھا ہوا تھا۔"

"دراصل وہی رئیس الزماں بھی ہے۔ وہ ذہین ہے مگر مجرمانہ ذہن رکھتا ہے۔ اس نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

پرنسپل نے چونک کر پوچھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ فہیم ایسا نوجوان نہیں ہے۔"

"وہ ایسا ہی ہے۔ اس لیے اس وقت حوالات میں ہے۔"

"حوالات میں؟" پرنسپل نے بڑے دکھ سے کہا۔ "پورے صوبے میں اول آنے والا نوجوان حوالات میں ہے۔"

عبدالرحمان نے فہیم کے خط کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی پرنسپل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ فہیم نے ہماری کرن کو لکھا تھا۔ آپ خود اسے پڑھیں۔"

وہ خط لے کر پڑھنے لگا پھر زیر لب کہنے لگا۔ "یقین نہیں آتا۔ یہ فہیم نے لکھا ہے۔"

وہ دوبارہ اسے شروع سے پڑھنے لگا پھر بولا۔ "اس خط سے اس کی پریشانی اور بے چینی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر اس نے پریشان ہو کر' جذباتی انداز میں لکھ دیا ہے کہ کرن کو بھگا کر لے جائے گا تو ضروری نہیں ہے کہ اس نے ہی کرن کو اغوا کیا ہو۔"

"یہ خط پڑھ کر آپ کو یقین نہیں آرہا ہے لیکن پولیس والے اگلوا لیں گے کہ اس نے ہماری بیٹی کو کہاں جا کر چھپایا ہے۔"

"وہ کس تھانے میں ہے؟"

انہوں نے تھانے اور علاقے کے بارے میں بتایا۔ پرنسپل نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ خان اعظم خان اس کالج کا مالک تھا۔ اپنے کالج کی نیک نامی اور شہرت کے

لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہتا تھا اور فہیم جیسے طالب علموں کی قدر کرتا تھا اور انہیں تعلیمی سہولتیں فراہم کرتا تھا۔

جب پرنسپل نے اسے فہیم کے بارے میں بتایا کہ وہ اغوا کے کیس میں گرفتار ہو گیا ہے تو خان اعظم خان نے کہا۔ "ہمارے کالج کی نیک نامی کا مسئلہ ہے اور فہیم ہمارا سب سے قابلِ قدر اور ذہین طالب علم ہے۔ پہلے اسے حوالات سے نکالا جائے پھر ہم دیکھیں گے کہ اس پر لگایا ہوا الزام کہاں تک درست ہے؟ آپ تھانے پہنچیں' میں آرہا ہوں۔"

جب پرنسپل تھانے میں پہنچا تو دن کے دو بجے تھے۔ وہاں فہیم کے ماں باپ شام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ بدیع الزماں وہاں آکر اسے رہا کرانے والا تھا۔ پرنسپل نے انسپکٹر سکندر بخت سے کہا۔ "میں اس کالج کا پرنسپل ہوں جہاں فہیم پڑھتا ہے۔ میرا وہ اسٹوڈنٹ کہاں ہے؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "وہ حوالات میں ہے اور ابھی کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔"

پرنسپل نے کہا۔ "آپ ملنے پر پابندی کیوں لگا رہے ہیں۔ وہ صرف ایک ملزم ہے' اس کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا ہے۔"

"سوری' اوپر سے حکم آیا ہے اور ہم حکم کے بندے ہیں۔ اگر آپ ملنے کے لیے بضد ہیں تو اپنے سینئر سے فون پر بات کرتا ہوں۔ آپ یہاں تشریف رکھیں۔"

انسپکٹر نے دوسرے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے بند کیا پھر اس نے فون پر بدیع الزماں سے رابطہ کر کے کہا۔ "آپ نے کہا تھا' اس جوان کی حمایت کرنے کوئی نہیں آئے گا لیکن اس کے کالج کا پرنسپل اس سے ملنے آیا ہے۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "پرنسپل آیا ہے تو فہیم سے ملا دو۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم نے اسے لہولہان کر دیا ہے۔ اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہے۔ پرنسپل اس کی حالت دیکھ کر میرے خلاف کارروائی کرے گا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر روکا ہے کہ سینئر افسران نے فہیم سے کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی ہے۔"

"تو پھر اپنی بات پر اڑے رہو۔ پرنسپل کو فہیم سے ملنے نہ دو۔"

"میں ابھی پرنسپل کو ٹال دوں گا اور فہیم کو اس کے ماں باپ کے حوالے کر دوں گا۔ اسے تھانے میں زیادہ دیر روکا گیا تو مصیبت میں پڑ جاؤں گا۔ وہ پرنسپل اپنے ذرائع استعمال کر سکتا ہے۔"

"تم جو مناسب سمجھتے ہو کرو۔ پہلے پرنسپل کو رخصت کرو تاکہ وہ فہیم کا حلیہ نہ دیکھ سکے۔"

وہ ریسیور رکھ کر دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آیا تو ایک دم ٹھٹک گیا۔ خان اعظم خان آئی جی پولیس کے ساتھ آیا تھا۔ اتنے بڑے افسر کو دیکھ کر پورے تھانے کا عملہ الرٹ ہو گیا تھا۔ انسپکٹر نے سامنے پہنچ کر سیلوٹ کیا۔ آئی جی نے کہا۔ "فہیم الزماں کو یہاں لاؤ۔"

انسپکٹر نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "سر! ہم نے لڑکی کو برآمد کرنے کے لیے تھرڈ ڈگری کا استعمال کیا تھا' وہ کچھ زخمی ہو گیا ہے۔"

"تھرڈ ڈگری کا استعمال عادی مجرموں پر کیا جاتا ہے۔ تم نے اس اسٹوڈنٹ کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے؟ ہمیں اس کے پاس لے چلو۔"

انسپکٹر کے ساتھ آئی جی' خان اعظم خان اور پرنسپل عقوبت خانے میں آئے۔ فہیم فرش پر ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر پہلے تو سب سکتے میں رہ گئے۔ پرنسپل نے کہا "اوہ گاڈ! یہ تو درندگی کی انتہا کی گئی ہے۔"

خان اعظم خان نے کہا۔ "انسپکٹر! میں تو تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ عدالت سے تمہیں سزا دلاؤں گا۔"

خان اعظم نے فوراً فون کر کے پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز کو تھانے پہنچنے کا حکم دیا۔ آئی جی نے کہا۔ "انسپکٹر! اپنی پیٹی اتار دو اور تم نے اس طالب علم کے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا تحریری بیان دو۔"

پرنسپل نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "میرے اللہ! اس ملک میں ذہانت اور علم کا یہ حشر ہو رہا ہے۔ اس کے بوڑھے ماں باپ دیکھیں گے تو ان کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ اسے فوری طبی امداد پہنچانا چاہیے۔"

خان اعظم نے کہا۔ "نہیں' یہ جوان ہے۔ اس میں قوتِ برداشت ہے۔ پہلے اس کی تصویریں اتاری جائیں گی پھر اسے اسپتال پہنچایا جائے گا۔"

آئی جی نے فون کے ذریعے دوسرے اعلیٰ افسران کو بلایا۔ انہیں فہیم کی حالت دکھائی پھر ان کی موجودگی میں انسپکٹر سکندر بخت سے تحریری بیان لینے لگا۔ اس کی ملازمت جانے والی تھی۔ آئندہ اسے پچاس ہزار روپے دینے والا بدیع الزماں اس کے کام آسکتا تھا۔ اس لیے اپنے بیان میں بدیع الزماں پر آنچ نہیں آنے دی کہ اسی کی خواہش کے مطابق اس نے فہیم پر اس قدر ظلم کیا تھا۔

خان اعظم خان بہت دولت مند وسیع ذرائع کا مالک تھا۔ اس کے فون کرتے ہی پریس رپورٹرز اور فوٹو گرافرز پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد بدیع الزماں بھی فہیم کی رہائی کے لیے پہنچ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور اس نے آئی جی وغیرہ کے سامنے انسپکٹر سکندر بخت سے کہا۔ "تم نے فون پر کہا تھا کہ مجھ سے کچھ رقم لے کر مک مکا کر لو گے اور فہیم کو رہا کر دو گے لیکن تم نے میرے آنے کا انتظار نہیں کیا۔ فہیم جیسے نیک' ذہین اور قابلِ فخر طالب علم کی یہ حالت کر دی۔ کیا تمہیں یقین نہیں تھا کہ میں یہ کیس ختم کرنے اور اس بیچارے کو اغوا کے الزام سے بچانے کے لیے تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گا۔"

آئی جی نے کہا۔ "آپ میرے سامنے کہہ رہے ہیں کہ اسے ایک لاکھ روپے رشوت دینے والے تھے؟"

بدیع الزماں نے کہا۔ "ہاں' رشوت دینا اور لینا جرم ہے لیکن اس طالب علم کو اس درندے سے بچانے کے لیے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

انسپکٹر سکندر بخت نے کہا۔ "آپ نے ایک لاکھ روپے تو کیا ایک روپیہ بھی دینے کی بات نہیں کی تھی۔ آپ مجھ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہیں۔"

فہیم کے باپ نے کہا۔ "جب یہ پھون پر ایک لاکھ روپے دینے کی بات کر رہے تھے تو ہم میاں بیوی موجود تھے۔ آپ نے ہمیں اسی لیے یہاں بٹھایا ہے کہ یہ فرشتہ جیسے صاحب آکر ایک لاکھ دیں گے تو ہمارے بیٹے کو چھوڑ دیں گے پھر کبھی الزام نہیں لگائیں

گے کہ ہمارے بیٹے نے کرن کو اَغوا کیا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "مجھے خواہ مخواہ پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مسٹر بدیع الزماں نے کہا تھا کہ میں فہیم کی ایسی پٹائی کروں کہ اسے اپاہج بنا دوں۔"

آئی جی نے کہا۔ "ابھی تم نے جو تحریری بیان دیا ہے' اس میں مسٹر بدیع الزماں کے خلاف کچھ نہیں لکھا۔ اب مک مکا کرنے کا بھید کھل رہا ہے تو تم مسٹر بدیع الزماں کے خلاف بول رہے ہو۔ ویسے ان کے خلاف زہر اگلنے سے تمہارے خلاف کارروائی میں کمی نہیں ہو گی۔"

فہیم کے لیے ایمبولینس لائی گئی۔ ماں باپ اس کی مُردوں جیسی حالت دیکھ کر دہاڑیں مار مار کر اور سینہ پیٹ پیٹ کر رونے لگے۔ اسے باقاعدہ علاج کے لیے اسپتال پہنچایا گیا۔

کرن کی ماں اور ماموں نے بھی اسے دیکھا۔ کرن کی ماں نے کہا۔ "ہم یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی ایسی حالت بنا دی جائے۔ ہمیں تو صرف اپنی بیٹی چاہیے۔ وہ جہاں بھی ہے' ہمیں مل جائے۔"

ایک پولیس آفیسر نے کہا۔ "آپ کی بیٹی مل جائے گی۔ ہم کوشش کر رہے ہیں۔"

عبدالرحمان نے کہا۔ "اتنی مار کھانے اور نیم مُردہ ہونے کے بعد بڑے بڑے مجرم بھی اپنے جرم کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اس نے مرتے مرتے بھی اعتراف نہیں کیا ہے۔ یااللہ! ہماری کرن کو پھر کس نے اغوا کیا ہے؟"

ماں نے کہا۔ "یا اللہ! تُو ہی ہماری بیٹی کے بارے میں جانتا ہے۔ وہ جہاں بھی ہے' اسے اپنے حفظ و امان میں رکھ۔ ہمارا سر نہ جھکے' اس کی عزت پر آنچ نہ آئے۔ آمین!"

☆========☆========☆

اگر بہت عالیشان اور آرم دہ محل میں رہا جائے لیکن اس کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اس طرح بند کر دیئے جائیں کہ انہیں کھولا نہ جا سکے' باہر سے تازہ ہوا نہ آئے اور آسمان دکھائی نہ دے تو وہ عالیشان محل بھی قید خانہ بن جاتا ہے۔

کرن کے نصیب میں محل نہیں تھا مگر دو بیڈ روم کا ایک چھوٹا سا مکان تھا' جہاں

اسے قید کیا گیا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ ان پر باہر سے کیلیں ٹھونک دی گئی تھیں تاکہ وہ اندر سے نہ کھول سکے۔ صرف دروازے پر کیلیں نہیں لگائی گئی تھیں بلکہ اس بند دروازے کے پاس ایک گن مین ایک چارپائی بچھائے بیٹھا رہتا تھا۔ دوسرے کمرے میں اس کی موٹی سی بیوی اپنے ایک شیرخوار بچے کے ساتھ تھی۔ اس کمرے میں دو چارپائیاں تھیں۔ ایک پر وہ موٹی عورت بچے کے ساتھ سوتی تھی۔ دوسری چارپائی کرن کے لیے تھی لیکن وہ پچھلی رات سے نہیں سوئی تھی۔ وہ چارپائی پر بیٹھی رہی تھی۔ اسے کھانا پیش کیا گیا تھا۔ اس نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

گن مین کی بیوی چہرے سے ہی ظالم اور سفاک دکھائی دیتی تھی۔ اس نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "کتنے دن نہیں کھائے گی؟ کتنی راتوں کو نہیں سوئے گی؟ جب بھوکی مرے گی تو کیا یہاں تیرے اوپر کوئی رونے آئے گا؟"

کرن نے کہا۔ "میں بھوکی پیاسی مرنا نہیں چاہتی' میں کھاؤں گی۔ پہلے صرف اتنا بتا دو کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تم لوگوں نے کس کے حکم پر ایسا کیا ہے؟"

"تمہیں کھانا ہے تو کھاؤ۔ مرنا ہے تو مر جاؤ مگر ہم سے تم کچھ معلوم نہیں کر سکو گی۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ جب تک زندہ رہو گی' تمہیں یہاں قیدی بنا کر رکھنے کے روپے ہمیں ملتے رہیں گے۔ مر جاؤ گی تو کہیں دور تمہاری لاش پھینک دیں گے۔"

وہ انہیں مرنے کی دھمکی دے کر معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اسے کس کے حکم سے وہاں لایا گیا ہے اور وہ کون سی جگہ ہے؟ لیکن وہ موٹی عورت بڑی پتھر دل تھی۔ اتنی سخت تھی کہ کسی نہ کسی بات پر اپنے گن مین شوہر کو بھی ڈانٹ کر چپ کرا دیتی تھی۔ اپنے ننھے سے بچے کو اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے اتنی زور سے تھپک کر سلاتی تھی جیسے اس کی پٹائی کر رہی ہو۔ اچھی خاصی تگڑی تھی۔ کرن کی کلائی پکڑ لیتی تو وہ اپنی کلائی چھڑا نہیں سکتی تھی۔

وہ پہلے دن بھوکی رہی۔ رات بھر چارپائی پر بیٹھی جاگتی رہی۔ سوچتی رہی کہ کس نے اسے اغوا کیا ہے؟ ویسے اغوا کرنے والے چار مسلح افراد گاڑی میں آئے تھے پھر اسے کالج کے احاطے میں جانے سے پہلے ہی اٹھا کر گاڑی میں لے آئے تھے۔ ان کے پاس ریوالور

اور رائفلیں تھیں۔ انہوں نے دن دہاڑے یہ واردات کی تھی اور کسی نے انہیں روکنے کی جرأت نہیں کی تھی بلکہ ہتھیار دیکھ کر دور بھاگ گئے تھے۔

اغوا کرنے والوں نے منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا پھر گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں کو بھی پیچھے سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ دیکھ نہ سکی کہ اغوا کرنے والے اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ گاڑی ڈھائی یا تین گھنٹے چلتی رہی۔ کبھی راستہ ہموار لگا اور کبھی ناہموار اور کبھی اس نے محسوس کیا کہ گاڑی کچے راستے پر چل رہی ہے۔

اس طرح یہ سمجھ میں آگیا کہ اسے شہر سے بہت دور کسی ایسی جگہ لایا گیا ہے جہاں وہی ایک مکان ہے۔ اگر آس پاس مکانات ہوتے تو وہاں کے مکینوں کی یا بچوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ اس نے اب تک کسی قسم کی گاڑی کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔

دوسری صبح اسے بھوک بھی لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کھا پی کر نیند پوری کرنے سے دماغ اس قابل ہو جائے گا کہ موقع ملے تو وہاں سے فرار ہو سکے۔ اسے جس شیطان کے حکم سے وہاں پہنچایا گیا ہے' وہ ضرور یہاں آئے گا پھر اسے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔ وہ ابھی تک نہیں آیا تو کوئی مصلحت ہو گی۔ اس کی آمد سے پہلے وہ وہاں سے فرار ہونے کی تدبیر سوچ رہی تھی۔

وہ جس کمرے میں تھی اس کے ساتھ کچن تھا جہاں پکانے اور کھانے کا تمام سامان موجود تھا۔ گیس کا چولھا تھا۔ وہ موٹی عورت تینوں وقت کا کھانا پکایا کرتی تھی۔ دوسری صبح کرن نے پیٹ بھر کر کھا لیا اور پھر تھوڑی دیر بعد سو گئی۔

اپنے گھر میں ہوتی تو ایک رات جاگنے کے بعد گھوڑے بیچ کر سوتی۔ وہاں تین گھنٹے بعد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ننھا بچہ رو رہا تھا۔ وہ عورت ٹائلٹ گئی تھی۔ اس کا شوہر دوسرے کمرے کے دروازے کے ساتھ اپنی گن لیے چارپائی پر بیٹھا تھا۔

کرن اس بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا کر ٹہلنے لگی۔ اسے بہلانے پھسلانے لگی مگر وہ چپ نہیں ہو رہا تھا۔ اس عورت نے ٹائلٹ سے باہر آکر بچے کو اس سے لیا۔

"بچے کبھی ایسے بھی چپ ہوتے ہیں' نہ سوتے ہیں تم نے دیکھا نہیں' میں اسے کیسے سلاتی

ہوں؟"

کرن نے کہا۔ "یہ بھوکا ہے۔"

اس نے بچے کو چارپائی پر ڈالا اور پھر اپنے بھاری اور موٹے ہاتھوں سے تھپکنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا' اسے مار رہی ہو۔ کرن نے کہا۔ "تم اس بیچارے کو اتنا مارتی کیوں ہو؟"

"کوئی ماں اپنے بچے کو دشمنی سے نہیں مارتی ہے۔ یہ میرا پہلا بچہ ہے۔ میں تو اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ میں تو اپنے لاڈلے کو کبھی مارنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی پشت پر ہاتھ مارتی جا رہی تھی۔ بچہ بھی مار کھانے کا عادی ہو گیا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر سو گیا۔ کرن حیرانی سے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا "یہ تمہارا بیٹا ہے اگلی بار بیٹی ہو گی تو کیا کرو گی؟"

"تم کیسی باتیں پوچھ رہی ہو؟ بیٹی ہو گی تو کیا اسے پھینک دوں گی؟ وہ میری اولاد ہو گی۔ میں اسے بھی کلیجے سے لگا کر رکھوں گی۔"

"وہ خوب صورت ہو گی' جوان ہو گی۔ اسے اغوا کر لیا جائے گا تو کلیجے سے کیسے لگاؤ گی؟"

وہ کرن کو گھور کر دیکھنے لگی پھر بولی۔ "میں تمہاری ماں جیسی نہیں ہوں کہ اپنی بیٹی کو اغوا ہونے کے لیے آزادی سے گھومنے پھرنے دوں گی۔"

"گھر کی چار دیواری میں چھپا کر رکھا جائے' تب بھی لڑکیاں اغوا کر لی جاتی ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ آج دوسروں کی بیٹی پر ظلم کیا جا رہا ہے' کل اپنی بیٹی پر بھی ایسا برا وقت آ سکتا ہے۔"

"جب ایسا وقت آئے گا تو ہمیں جو کرنا ہو گا' کریں گے۔ تم گھما پھرا کر باتیں نہ کرو۔ چالاکی سے یہ نہ سمجھو کہ ایسی باتیں کرو گی تو ہم تمہیں یہاں سے جانے دیں گے۔"

"میں عقل کی بات سمجھا رہی ہوں۔ کیا تم چاہو گی کہ تمہارے مرد کے سوا' کوئی تمہارے بدن کو ہاتھ لگائے۔"

"کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔ میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی۔"

"تمہیں اپنی عزت پیاری ہے۔ کیا میری کوئی عزت نہیں ہے؟"

"کیا ہم نے تمہاری عزت بچانے کا ٹھیکہ لیا ہے؟ ہمیں ہزاروں روپے مل رہے ہیں۔ ہمارا دھندا چل رہا ہے۔ ہمیں اس سے کیا لینا کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟"

"ٹھیک کہتی ہو۔ آدمی اپنے زخم کی ٹیسوں کو خود ہی برداشت کرتا ہے۔ کوئی دوسرا اس کا دکھ برداشت کرنے نہیں آتا۔"

وہ چارپائی پر لیٹ کر چھت کو تکنے لگی۔ سوچنے لگی' نصیب میں پتا نہیں کیا لکھا ہے؟ یہاں سے رہائی یا عزت کی موت؟ رہائی پانے یا فرار ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ عورت چٹان کی طرح سخت تھی اور اس کے شوہر کے پاس بھری رائفل اور ایک پستول تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرنے کا انجام موت ہو گا۔

☆=========☆=========☆

تشدد کے ذریعے فہیم کو جس طرح نیم مُردہ بنایا گیا تھا' یہ بات تھانے تک محدود رہتی تو بدیع الزماں فکر مند نہ ہوتا۔ اس نے صرف اس حد تک سوچا تھا کہ ان سبزی بیچنے والوں کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہیں ہو گا۔ اس پر جیسا تشدد کیا گیا ہے' اس کے خلاف کوئی آواز اٹھانے والا نہیں ہو گا۔ بدیع الزماں نے اس پہلو سے غور نہیں کیا تھا کہ کالج کے پرنسپل اور مالکان ایسے طالب علم کے لیے قوت بن جائیں گے' جس نے پورے صوبے میں اول پوزیشن حاصل کی تھی اور آئندہ ان کے کالج کا نام روشن کرنے والا تھا۔

اب بدیع الزماں کے مقابلے میں خان اعظم خان تھا جو دولت میں اور وسیع ذرائع اختیار کرنے میں اس سے کم نہیں تھا۔ اس لیے وہ فکر مند ہو گیا تھا کہ اس کے اپنے بیٹے کی نااہلی کا بھید نہ کھل جائے۔ وہ فہیم کے ماں باپ کو صبح و شام اپنے پاس بلاتا تھا اور ان سے بیٹے کی قسمیں لے کر یہی...... کہتا تھا کہ اسپتال میں دن رات بیٹے کے پاس رہیں اور اسے ایسا بیان نہ دینے دیں' جس سے یہ راز کھل جائے کہ اس نے اپنی دولت اور غریب کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی ذہانت خریدی ہے۔

پھر وہ فہیم کی مزاج پرسی کے لیے اسپتال بھی گیا لیکن اس کی حالت ایسی تھی کہ وہ

اچھی طرح منہ نہیں کھول سکتا تھا۔ کچھ بولنے کے قابل نہیں تھا۔ خان اعظم خان نے اپنے ذرائع استعمال کر کے یہ پابندی لگوا دی تھی کہ جب تک فہیم کا باقاعدہ علاج نہ ہو جائے اور وہ پولیس اور پریس کو بیان نہ دے' تب تک اس کے کمرے میں کسی کو جانے کی اور اس سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

خان اعظم خان نے بدیع الزماں کو اسپتال میں دیکھ کر پوچھا۔ "آپ اور یہاں؟ اس سے پہلے تھانے آئے تھے۔ کیا فہیم سے کوئی رشتے داری ہے؟"

"نہیں' میری اس سے رشتے داری ہوتی تو وہ ایسا غریب' بے بس اور مجبور نہ ہوتا۔ دو برس پہلے میں نے چند اخبارات میں اشتہار دیا تھا کہ جو طالبعلم بہت ذہین ہیں اور مالی مشکلات کی وجہ سے تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے' میں انہیں تعلیم جاری رکھنے کے لیے مالی امداد دیتا رہوں گا۔"

"اچھا' تو آپ کی امداد سے اس نے تعلیم جاری رکھی ہے۔ یہ تو آپ بہت ہی نیک اور تعمیری کام کر رہے ہیں لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جس انسپکٹر نے فہیم کو اسپتال پہنچا دیا' اسے ایک لاکھ روپے دے کر آپ یہ کیس...... ختم کیوں کرانا چاہتے تھے؟"

"اس لیے کہ میں فہیم کو بے قصور سمجھتے ہوئے بھی اسے انسپکٹر کے ظلم سے بچا نہیں سکتا تھا۔ ایک لاکھ ضائع کر سکتا ہوں لیکن اپنا قیمتی وقت عدالت میں ضائع نہیں کر سکتا تھا۔"

"یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارے اور آپ جیسے بزنس مین کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے لیکن انسپکٹر کو رشوت دینا غیر قانونی عمل تھا پھر وہ انسپکٹر اس اغوا کے معاملے کو دبا دیتا۔ لڑکی والوں کو تھانے دوڑاتا رہتا۔ فہیم کی طرح کسی دوسرے کو قربانی کا بکرا بنا دیتا پھر بھی لڑکی کا سراغ نہ ملتا۔"

"میں نے جو کیا' وہ فہیم کی ذہانت سے متاثر ہو کر کیا۔ مجھے اس لڑکی سے ہمدردی ہے۔ ویسے یہ معاملہ اتنا گمبھیر ہو گیا ہے کہ پولیس اور انٹیلی جنس والے اسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

خان اعظم خان نے کہا۔ "اللہ کرے وہ زندہ سلامت مل جائے لیکن ہمارا یہ شہر مقتل بن چکا ہے۔ اغوا ہونے والوں کی لاشیں ہی ملا کرتی ہیں۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "اخبارات میں پڑھ کر اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے پاکستان کا اتنا بڑا شہر آسیب زدہ اور قاتلوں کا مسکن بن گیا ہے۔ میں ابھی جا کر اخبارات میں اشتہار دوں گا کہ جو کرن خورشید نامی لڑکی کو تلاش کر کے گھر پہنچائے گا' اسے میری طرف سے پچاس ہزار روپے دیئے جائیں گے۔"

"میں نے آپ کا نام سنا تھا۔ آپ سے ملاقات بھی ہو گئی۔ آپ بہت نیکیاں کرتے ہیں۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ کرن کی بازیابی کے لیے آپ ایک بہت بڑی رقم کرچ کریں گے۔ میری دعا ہے کہ کوئی انعام کے لالچ میں ہی کرن کو واپس کر دے۔"

بدیع الزماں اس سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد خان اعظم خان نے پرنسپل سے کہا "ایک بات بڑی عجیب ہے اور مجھے کھٹک رہی ہے۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ اسکول اور کالج میں اس جوان کا نام فہیم الزماں ہے ورنہ وہ ہر جگہ رئیس الزماں کہلاتا ہے پھر ایک حیران کن بات یہ ہے کہ فہیم کے باپ کا نام بھی بدیع الزماں ہے۔"

"جی ہاں۔ ادھر امیر طبقے میں باپ بیٹے کا نام بدیع الزماں اور رئیس الزماں ہے اور ادھر غریب طبقے میں باپ بیٹے کا نام بالکل وہی ہے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے کہ جس طرح کبھی کبھی ہم شکل افراد نظر آجاتے ہیں' اسی طرح اکثر ہم نام افراد بھی ہوا کرتے ہیں لیکن میں پہلی بار ہم نام باپ اور ہم نام بیٹے کا نام سن رہا ہوں۔"

"یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اس کا نام صرف اسکول و کالج میں فہیم الزماں کیوں ہے؟ اور وہ گھر میں' دوست احباب میں حتیٰ کہ جس کرن کو دیوانہ وار چاہتا ہے' اس کی نظروں میں بھی رئیس الزماں کیوں کہلاتا ہے؟"

خان اعظم خان نے کہا۔ "انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسران سے بھی میری شناسائی ہے۔

میں کسی سراغ رساں کی خدمات حاصل کرتا ہوں.......... مجھے دو باپ اور دو بیٹوں کا ہم نام ہونا کھٹک رہا ہے۔"

پرنسپل نے کہا۔ "ہم سب ایک اور افسوس ناک بات یہ جانتے ہیں کہ ذہین طلبہ بڑی بڑی سندیں حاصل کرنے کے باوجود بے روزگار رہتے ہیں۔ جب ملازمت نہیں ملتی اور روزی حاصل کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا تو وہ ضروریاتِ زندگی سے مجبور ہو کر اپنی ذہانت بیچتے ہیں۔ رئیس زادوں سے بڑی رقمیں لے کر ان کی جگہ امتحانات ہال میں بیٹھ کر پرچے حل کرتے ہیں۔ بورڈ کے امتحانات کے ایڈمٹ کارڈ میں طلبہ کی تصویریں لگا دیتے ہیں۔ ایسے ایڈمٹ کارڈ میں ہیرا پھیری سے تصویریں بدل کر اپنی تصویر لگا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ ایک آدھ طالب علم ایسا فراڈ کرتے ہوئے پکڑا گیا لیکن ایسے فراڈ کے خلاف مؤثر کارروائی نہیں کی گئی اس لیے یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ہمارے ملک میں پہلے ہی ناخواندگی ہے۔ تعلیمی فراڈ کے ذریعے ناخواندگی کے علاوہ نااہل جوانوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔"

خان اعظم خان اور پرنسپل نے ڈاکٹروں سے فہیم کے بارے میں پوچھا۔ ایک ڈاکٹر نے کہا۔ "وہ ہوش میں ہے مگر اپنے حواس میں نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ حواس درست ہو جائیں گے۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

اسی وقت فہیم کے ماں باپ وہاں آگئے۔ ماں نے ایک ڈاکٹر سے کہا۔ "میں رئیس الجمع کی ماں ہوں اور یہ باپ ہیں لیکن ہمیں اپنے بیٹے سے ملنے نہیں دیا جا رہا ہے۔ اس کے کمرے کے سامنے پولیس والے ہیں۔ ہمیں بیٹے کے پاس جانے نہیں دے رہے ہیں۔ یہ تو ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "بی بی! یہ پولیس کیس ہے۔ آپ کا بیٹا جب تک پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں آئے گا اور اپنا بیان دینے کے قابل نہیں ہو گا تب تک پولیس والے کسی کو اس سے ملنے نہیں دیں گے۔"

پرنسپل نے ان سے کہا۔ "آپ ہمارے ساتھ آئیں' ہم آپ کو ضروری باتیں سمجھائیں گے۔ آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کے بیٹے پر تمام ڈاکٹر توجہ دے رہے ہیں۔ ہم

آپ کو اس سے جلد ہی ملائیں گے۔ پلیز' ہمارے ساتھ آئیں۔"

خان اعظم خان اور پرنسپل انہیں اسپتال کے ویٹنگ روم میں لے کر آئے۔ پرنسپل نے فہیم کے باپ سے کہا۔ "انسپکٹر نے بڑی رقم حاصل کرنے کے لالچ میں آپ کے بیٹے کو مار ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ آپ ضرور چاہیں گے کہ اس انسپکٹر کو عدالت سے سزا ملے۔"

باپ نے کہا۔ "ہم صرف اپنے بیٹے کی زندگی چاہتے ہیں۔ تھانے کچہری جانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔"

خان اعظم خان نے کہا۔ "قانونی کارروائی ہم کریں گے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ ظالم کو سزا ملے؟"

"جناب! ہم وہی کریں گے جو ہمارا محسن کہے گا۔ وہ صرف محسن نہیں فرشتہ بھی ہیں۔ ہمارے بیٹے کو.......... پڑھائی کے لیے مدد دیتے ہیں۔ وہ اچھی بات سمجھاتے ہیں کہ ہمیں تھانے کچہری کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ آپ اپنے محسن کی عزت کرتے ہیں اور اس کی باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ کیا محسن کے کہنے پر ہی آپ نے بیٹے کا نام رئیس الزماں رکھا ہے؟"

"جی ہاں! آپ دیکھیں کہ نام بدلنے سے ہمارے نصیب بھی بدل گئے۔ اسی لیے ہم انہیں فرشتہ کہتے ہیں۔"

"اور فرشتے کے کہنے سے ہی آپ نے اپنا نام بدیع الزماں رکھا ہے؟"

"نہیں جی! بدی الجمع تو میرا بچپن کا نام ہے مگر میں نے اپنے محسن کے سامنے اپنا نام نہیں لیتا ہوں۔"

"اس کے سامنے اپنا نام کیوں نہیں لیتے ہو؟"

"وہ ناراج ہو جاتا ہے۔ میں نام لیتا ہوں تو اس کے معنی بدل جاتے ہیں۔ نام سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں برائیوں کا مجموعہ ہیں۔"

خان اعظم خان اور پرنسپل نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا پھر پرنسپل نے کہا "آپ لوگ جائیں۔ کل شام سے پہلے بیٹے سے ملنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ آپ کے وہ

محسن اور فرشتہ صاحب بھی آپ کو فہیم سے نہیں ملا سکیں گے۔"

"آپ اس کو فہیم نہ بولیں۔ اس کا نام رئیس الجمع ہے۔"

"ہمارے کالج میں وہ فہیم الزماں ہے۔ اس لیے ہم اسے فہیم ہی کہیں گے۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ وہ رئیس الزماں کے نام سے تعلیم کیوں نہیں حاصل کر رہا ہے؟"

ماں نے کہا۔ "اسے اپنا پہلا نام پسند ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ نصیب بدلنے کے لیے اس کا نام بدلا گیا ہے۔"

"اور وہ دولت مند بدی الجمع نصیب بدل رہا ہے؟"

"جی ہاں' اللہ رسول کے بعد وہی ہمارے لیے سب کچھ ہیں۔"

"بہتر ہے' آپ گھر چلے جائیں۔ کل شام سے پہلے بیٹے کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔"

وہ دونوں اٹھ کر انہیں سلام کر کے چلے گئے۔ خان اعظم خان نے پرنسپل سے کہا "میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بدیع الزماں نے فہیم اور اس کے ماں باپ سے سودے بازی کی ہے۔ اس کا اپنا بیٹا رئیس الزماں کند ذہن ہو گا۔ اس کے لیے فہیم کی ذہانت خرید لی ہے۔"

پرنسپل نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "آپ انٹیلی جنس والوں کے ذریعے بہت کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔"

خان اعظم خان سوچنے لگا کہ یہ لوگ بدیع الجمع کے احسان مند ہیں۔ فہیم بھی اس سے مالی امداد حاصل کرتا رہا ہے۔ اس لیے وہ بھی ہوش و حواس میں آنے کے بعد یہ اعتراف کبھی نہیں کرے گا کہ وہ ایک رئیس زادے رئیس الزماں کی جگہ امتحانات دے کر اسے انٹر کے سیکنڈ ائیر میں پہنچا چکا ہے۔

پولیس والے ایسے اندرونی راز تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ حقیقت معلوم کرنے کے لیے اب انٹیلی جنس والوں سے ہی کام لینا ہو گا۔ ہو سکتا ہے' اس طرح اغوا کی جانے والی لڑکی کا سراغ مل جائے۔

خان اعظم خان سر جھکا کر سوچنے لگا کہ ان رئیس باپ بیٹے کو کس طرح گھیرا جا سکتا

ہے؟"

☆=========☆=========☆

بدیع الزماں بے چینی سے ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹا صوفوں پر بیٹھے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے۔ بیگم نے کہا "ایک تو پریشان ہیں۔ اس پر اتنی دیر سے ٹہل رہے ہیں۔ تھک جائیں گے۔ ذرا آرم سے بیٹھ جائیں۔"

وہ بولا۔ "کیا بیٹھنے سے آرام مل جائے گا اور جو مسئلہ ہے' وہ حل ہو جائے گا؟"

رئیس الزماں نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ فکر نہ کریں۔ وہ لوگ یہ کبھی نہیں کہیں گے کہ ان کا بیٹا میری جگہ امتحانات کے پرچے دیتا تھا۔ وہ غریب ہیں' گئے گزرے ہیں مگر سچے اور زبان کے پکے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "ان کے بیٹے نے مرنے کی حد تک مار کھائی پھر بھی آپ اور میرے بیٹے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ آپ کو اندیشہ کیا ہے؟"

بدیع الزماں نے کہا۔ "جب غریب لوگ محتاج اور کمزور ہوتے ہیں' زبان کے سچے اور پکے ہوتے ہیں لیکن کوئی مخالف ان کا مددگار اور ان کی طاقت بن جائے تو پھر وہی وفادار غریب' باغی بن کر ہمیں آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔ میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ خان اعظم خان جیسا رئیس زادہ اس فہیم کے معاملے میں دلچسپی لے گا۔ وہ اپنے کالج کی نیک نامی کے لیے فہیم سے کسی نہ کسی طرح اصلیت اگلوا لے گا۔"

بیگم نے کہا۔ "ہم آپ کا اندیشہ دور نہیں کر سکتے لیکن میں یقین سے کہتی ہوں کہ فہیم آدھی جان دے چکا ہے۔ پوری جان دینے سے پہلے بھی آپ باپ بیٹے کا ذکر نہیں کرے گا۔"

بدیع الزماں نے اپنے بیٹے کو ناگواری سے دیکھا پھر کہا۔ "بیگم! تمہاری باتوں سے ذرا تسلی ہوتی ہے مگر یہ ہمارا بیٹا ہے نا اس کے دماغ میں بھُس بھرا ہوا ہے۔ اسے تعلیم میں دلچسپی ہوتی' یہ ہر سال اچھے مارکس حاصل کرتا تو ہمیں کسی کی ذہانت خریدنی نہیں پڑتی۔ اسے پاکستان میں نچلے معیار کی تعلیم حاصل نہ کرنا پڑتی۔ یہ بھی دوسرے ذہین رئیس

زادوں کی طرح یورپ اور امریکا میں تعلیم حاصل کر رہا ہوتا۔"

"اب آپ کو میرے بیٹے پر غصہ آرہا ہے۔ پلیز آرام سے بیٹھ جائیں۔"

"فار گاڈ سیک' بیٹے کی حمایت میں آج کچھ نہ کہنا۔ یہ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اور کوئی اولاد نہیں ہے۔ جب سے پیدا ہوا ہے' ہم نے اسے سر چڑھا رکھا ہے۔ ہم دونوں اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں لیکن یہ ہمیں کیا دے رہا ہے؟ ذلت اور رسوائی کا خوف دے رہا ہے۔ ابھی بات بگڑی نہیں ہے مگر بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ تم یقین کرو خان اعظم خان اپنے آدمیوں کے ذریعے ہماری نگرانی کرا رہا ہو گا۔"

بیگم نے کہا۔ "اسے نگرانی کرانے دیں۔ ہم کوئی ایسا کام نہیں کر رہے ہیں جس سے پکڑ میں آجائیں۔"

"ہمارا یہ بیٹا ایسی حماقت کرنے والا تھا۔ یہ اپنے فارم ہاؤس پر جانا چاہتا تھا جہاں کرن کو قید کیا گیا ہے۔ میں نے اسے سختی سے منع کیا ہے۔ یہ جائے گا تو خان اعظم خان کے کتے اس کے پیچھے لگ جائیں گے۔"

بیگم نے بیٹے سے کہا۔ "تم کیوں مسائل پیدا کرتے رہتے ہو۔ تمہارے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ کرن نے تمہاری توہین کی تھی' تم نے اسے اغوا کرا کے اور اسے قید کر کے انتقام لے لیا ہے۔ وہ کوئی آسمانی حور نہیں ہے جس پر تم مر رہے ہو۔ اتنی بڑی دنیا میں حسن ہی حسن بکھرا پڑا ہے۔ کیا اندھے ہو۔ اس سے زیادہ حسین لڑکی نظر نہیں آتی ہے؟"

رئیس الزماں نے کہا۔ "میں اسے فہیم کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑنا چاہتا۔"

"فضول باتیں نہ کرو اور نہ ہی کرن کا نام اب اپنی زبان پر لاؤ۔ وہ چھوٹی ذات کے لوگ ہیں۔ چھوٹی ذات کے کتے اسے نوچ کھسوٹ کر ختم کر دیں گے۔ کسی کو اس کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ اس طرح فہیم پر اس کے اغوا کا الزام برقرار رہے گا۔"

بیٹا ناراض ہو کر صوفے سے اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا زینے کے پاس آیا پھر اوپر کمرے میں چلا گیا۔ بدیع الزماں نے کہا۔

"بیگم! یہ بے لگام ہو رہا ہے۔ اسے قابو میں رکھو اگر ہم سے چھپ کر اس لڑکی کے

پاس جائے گا تو ضرور کوئی گڑبڑ ہو گی۔ میں تنہا کتنے مسائل سے نمٹ سکتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ یہ کوئی نیا مسئلہ پیدا کرے' اسے روکو اور اچھی طرح سمجھاؤ۔"

وہ صوفے سے اٹھ کر بیٹے کے پاس اوپری منزل کی طرف جانے لگی۔ سیکریٹری نے آ کر کہا۔ "سر! ایک ذہین طالب علم کو لے کر آیا ہوں۔ وہ میرے بھروسے کا لڑکا ہے۔"

"فہیم اور اس کے ماں باپ بھی بھروسے کے لوگ ہیں۔ انہوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ہماری اپنی غلطیوں کے باعث معاملہ بگڑنے والا ہے۔ ہم فہیم کا نام نہ بدلتے اور صرف بورڈ کے امتحانات میں اس کی ذہانت خریدتے اور اس کے بعد اس سے لاتعلق ہو جاتے پھر انٹر کے فرسٹ ائیر میں کسی دوسرے ذہین لڑکے کو رقم دے کر اس کی خدمات حاصل کرتے تو بہتر ہوتا۔"

"سر! آئندہ یہی کریں گے۔ فہیم کا کیس خیر خیریت سے ختم ہو جائے تو آئندہ سال کسی نئے ذہین طالب علم سے سودا کریں گے۔ طالب علم خواہ کتنا ہی ذہین ہو اور آپ کے بیٹے کے لیے امتحانات میں خواہ کتنی ہی اونچی پوزیشن حاصل کرے' آپ اسے دوسری بار منہ نہ لگائیں۔ پاکستان میں ذہین طلبہ کی کمی نہیں ہے۔ آپ کسی بھی ضرورت مند کو خرید سکتے ہیں۔"

"ہاں یہی دانش مندی ہے۔ یہ چھوٹے لوگ خواہ کتنے ہی ذہین ہوں' ان سے مستقل تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں۔ ان کی اوقات یہی ہے کہ انہیں پان کی طرح چبا کر تھوک دیا جائے۔ جاؤ اس نئے بکاؤ مال کو لے کر آؤ۔"

سیکریٹری ایک نئے ذہین طالب علم کو بلانے کے لیے باہر چلا گیا۔

☆=========☆=========☆

فہیم کو پہلے ہی ہوش آ گیا تھا۔ اب حواس بھی درست ہو گئے تھے۔ وہ اٹک اٹک کر بولنے لگا تھا۔ زبان میں ہلکی سی لکنت تھی مگر بات سمجھ میں آ جاتی تھی۔ ڈاکٹر نے فون کے ذریعے خان اعظم خان کو اطلاع دی کہ فہیم اب بیان دینے کے قابل ہو گیا ہے۔ خان اعظم خان آئی جی پولیس اور ایک انٹیلی جنس کے افسر بلال احمد کے ساتھ اسپتال پہنچ گیا۔

آئی جی ایسے معاملات میں ماتحت افسروں کو ہی بھیجتا تھا لیکن خان اعظم خان سے

دوستی کے سبب خود اس کے ساتھ آیا۔ بلال احمد بھی انٹیلی جنس کا ایک معروف افسر تھا۔ اس سے خان اعظم خان کی صرف دوستی ہی نہیں' رشتے داری بھی تھی۔ ان کے ساتھ دو ماتحت افسران بھی تھے۔

خان اعظم خان نے فہیم سے پوچھا۔ "کیا تم پورے ہوش و حواس میں رہ کر ان افسران کے سوالات کا جواب دے سکتے ہو؟"

وہ بولا۔ "جی۔ ہاں۔ مم میں پورے ہوش و حوا.......... حواس میں ہوں۔ بس ذرا بول.......... بولنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ مو.......... مجھے پہلے بتا۔ بتا دیں' کرن واپس آ گئی۔ ای ہے؟"

بلال احمد نے کہا۔ "وہ آ جائے گی۔ تم یہ بتاؤ' تمہارا کوئی دشمن ہے؟"

اس سوال پر اس کے تصور میں کرن کے حوالے سے اس رئیس زادے رئیس الزماں کا چہرہ آ گیا لیکن اس نے اس کا نام نہیں لیا' جواباً کہا۔ "لالچ سب سے بڑا دشمن ہے' اس تھانے دار کو مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی.......... اس نے لالچ میں آ کر مجھے اسپتال پہنچا دیا کہ جو بھی مجھے رہائی دلانے کے لیے آئے گا' اس سے اچھی خاصی رقم وصول کر لے گا۔"

"تم نے کرن کو مخاطب کر کے خط لکھا تھا کہ اسے بھگا کر لے جاؤ گے۔ کیا تمہاری تحریر سے ثابت نہیں ہوتا کہ تم نے اسے اغوا کیا ہے؟"

"جی ہاں ثا.......... ثابت ہوتا ہے مگر اللہ جانتا ہے' میں جسے شریکِ حیات بنانا چاہتا ہوں' اسے گھر سے بھگا کر دنیا کے سامنے اس کا سر نہیں جھکا سکتا اور خود سر اٹھا کر کسی کو مو.......... منہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس بے.......... چاری کو اغوا کرنے کا مجھ پر جھ.......... جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔"

"ہماری دنیا لین دین کے عمل پر قائم ہے۔ آدمی کچھ لیتا ہے تو دوسرے کو کچھ دیتا ہے۔ ماں بچے کو دودھ پلاتی ہے تو اس سے ممتا کی تسکین ہوتی ہے۔ گویا دودھ کا معاوضہ وہ تسکین کی صورت میں حاصل کرتی ہے۔ بدیع الزماں دو برسوں سے تمہارے تعلیمی اخراجات پورے کر رہا ہے۔ اس کے عوض تم اسے کیا دے رہے ہو؟"

"ک............کچھ نہیں۔ وہ معاوضے کے طور پر اپنے نیک جذبوں کی تسکین کرتا ہے۔"

خان اعظم خان نے کہا۔ "میں دولت مند طبقے میں بہت سے لوگوں کی طرح بدیع الزماں کو بھی جانتا ہوں۔ وہ کسی سے کچھ حاصل کیے بغیر ایک نیا پیسہ بھی اپنی جیب سے نکال کر نہیں دیتا۔ تم کوئی حقیقت چھپانا چاہو تو زبردستی نہیں ہے۔ ہمیں نہ بتاؤ۔ ہمارا.........کوئی نقصان نہیں ہو گا لیکن تمہارے تعاون کے بغیر کرن کا سراغ نہیں لگایا جا سکے گا۔ نہ اسے واپس بلایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی عزت بچائی جا سکے گی۔"

فہیم کشمکش میں پڑ گیا۔ بے چینی سے کسمسانے لگا۔ بدیع الزماں جیسے محسن کی عزت رکھنا اور اسے مشکلات سے بچانا اس کا فرض تھا۔ وہ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کرن کی عزت خاک میں مل جائے۔ وہ واپس آئے تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

اسے اضطراب میں مبتلا دیکھ کر بلال احمد نے کہا۔ "ایک کنواری لڑکی کی آبرو دنیا کی تمام دولت سے زیادہ اور دوسروں کے احسانات سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے اور اس کی آبرو تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے۔"

اتنی دیر میں اس نے ذہانت سے سوچا' اسے اغوا ہوئے آج تیسرا دن ہے۔ اس درمیان دو راتیں گزر چکی ہیں۔ پتا نہیں اب تک اس بے چاری پر کیا قیامت گزر چکی ہو گی۔ درندوں نے اسے چھوڑا نہیں ہو گا۔ اس بے قصور لڑکی کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہو گا۔ وہ واپس آئے گی لیکن لٹی ہوئی عزت واپس نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس بدیع الزماں کی عزت محفوظ ہے۔ اس نے اپنی سوسائٹی میں اپنا بھرم رکھا ہوا ہے۔ اس بھرم کو ٹوٹنا نہیں چاہیے۔

آئی جی نے پوچھا۔ "خاموش کیوں ہو؟ جواب دو۔"

"میں کرن کے لیے پریشا.........آن ہوں......... اگر اس کے اغ.........وا کا تعل.........لق......... مجھ سے یا میرے محسنوں سے ہوتا تو میں آ......... آپ کو ایک ایک بات بتا دیتا۔ میں کیا بتاؤں۔ یا.........ال اللہ! وہ کہاں ہو گی؟ تُو جانتا ہے' وہ

کیسی......... مصیبت میں ہو گی۔"

بلال احمد کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ "میں شاطر مجرموں کے حلق میں ہاتھ ڈال کر ان کے اندر سے بڑے بڑے راز نکال لیتا ہوں۔ تم واقعی ذہین اسٹوڈنٹ ہو اور باتیں بنا کر اپنے محسن کو تحفظ دے رہے ہو۔ اب صاف صاف باتیں ہو جائیں۔ ہمارے ملک میں دولت مندوں کا ایک طبقہ ایسا ہے' جن کی اولاد تعلیم کے معاملے میں کند ذہن ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی سوسائٹی میں برگر فیملی کی طرح انگریزی بولنا سکھا دیتے ہیں لیکن کالج اور یونیورسٹی سے بڑی بڑی سندیں حاصل نہیں کر پاتے۔ سوسائٹی میں' سیاست میں اور کاروباری دنیا میں ایسی بڑی سندوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی اولاد پر ناخواندگی کا لیبل پسند نہیں کرتے اس لیے بے روزگار اور ضرورت مند ذہین طلبہ و طالبات سے ان کی ذہانت خرید کر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سرٹیفکیٹس حاصل کر لیتے ہیں۔ تم نے بھی بدیع الزماں کے بیٹے رئیس الزماں کے لیے یہی کیا ہے۔"

"جن......... آپ! آپ مجھے الزام دے رہے ہیں۔"

"ابھی تو یہ الزام ہے لیکن میں اسے سچ ثابت کرنا جانتا ہوں۔"

"آپ بزرگ ہیں۔ تجر-بہ- کار ہیں۔ آ......... آپ سے در-خواست کرتا ہوں۔ اپ- اپ نے تجر-بے سے پہلے ایک لڑکی کی عزت بچال-ایں- او- سے ڈھونڈ لیں پھر موجھے اور ر-ے محسن کو پھان-سی پر چڑھا دیجئے۔"

"تم اس کے لیے پھانسی پر چڑھ جانا چاہتے ہو۔ اسے بہت چاہتے ہو۔ ایسا کیوں ہوا کہ جسے تم چاہتے ہو' اسی کو اغوا کیا گیا ہے؟"

"وہ اغو-وا کرنے والا پکڑا جائے گا تو معلوم ہو گا۔ مالوم نہیں مجھ سے کیا دشمن-نی ہے؟"

اسی وقت اس کے ماں باپ اس سے ملنے آئے۔ آئی جی نے ماتحت افسر سے کہا "انہیں اندر آنے دو۔"

وہ دونوں اندر آئے۔ ماں بیٹے کو دیکھ کر رونے لگی۔ باپ نے اس کے سر پر ہاتھ

پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "میرا بیٹا کیسا ہے؟ اب تو ہم روج اس سے مل سکتے ہیں؟"

بلال احمد نے کہا۔ "ہم اس کا بیان لے چکے ہیں۔ آپ روز صبح شام مل سکتے ہیں بلکہ آپ کے بیٹے کے محسن بدیع الزماں بھی آکر مل سکتے ہیں۔"

باپ نے کہا۔ "اب وہ کیا آئیں گے؟ ہم سے کہہ رہے تھے کہ کل وہ یہاں ملنے آئے تھے نگران کی بڑی بے عجتی ہوئی۔ انہیں میرے بیٹے سے ملنے نہیں دیا گیا۔"

آئی جی نے کہا۔ "اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے۔ قانون سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ پولیس کے بیان لینے سے پہلے ماں باپ کو بھی ملنے نہیں دیا گیا تھا۔"

"مگر وہ بڑے آدمی ہیں۔ ان کو معمولی پولیس نے اور کالج کے وہ جو بڑے استاد ہوتے ہیں انہیں کیا کہتے ہیں؟"

"پرنسپل۔"

"ہاں اسی بڑے استاد نے بھی روکا تھا اور کوئی کھان اجم کھان ہیں' انہوں نے بھی روکا تھا۔ وہ ہمارے پھرستہ جیسے محسن کو روکنے والے کون ہوتے ہیں؟"

"میں ہوں خان اعظم خان۔ تمہارا ذہین بیٹا میرے کالج کا قابلِ فخر اسٹوڈنٹ ہے۔ میں نے قانون کے مطابق تمہارے بیٹے کی بھلائی کے لیے انہیں اس کمرے میں آنے سے روکا تھا۔"

"ہمارے محسن سے جیادہ آپ ہمارے بیٹے کی بھلائی نہیں کر سکتے۔ ان کی مہربانیوں سے ہمارا بیٹا بڑی بڑی کتابیں پڑھتا ہے۔ اب ہم اپنے بیٹے کو آپ کے کالج میں نہیں پڑھنے دیں گے۔"

فہیم نے کہا۔ "ابا! آپ خام۔ اوش رہیں۔ آپ نہ۔ نہیں جانتے پرنسپل صاحب اور خا۔ خان صاحب کتنے عظیم اور محترم ہیں۔"

ماں نے حیرانی سے پوچھا۔ "بیٹے! یہ تم کیسے بول رہے ہو۔ تمہاری جبان کو کیا ہو گیا ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا بیٹا جلد ہی پہلے کی طرح بولنے لگے گا۔ ابھی اس سے زیادہ باتیں نہ کی جائیں تو بہتر ہے۔"

وہ سب ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کمرے سے باہر آگئے۔ ماں باپ نے بیٹے کو پیار کیا۔ دعائیں دیں پھر وہ بھی باہر آگئے۔ صرف انٹیلی جنس کا افسر بلال احمد رہ گیا۔

باپ نے پوچھا۔ "وہ آدمی ہمارے بیٹے کے پاس کیوں رہ گیا ہے؟"

خان اعظم خان نے کہا۔ "وہ اسپتال کا آدمی ہے۔ وہاں کمرے میں رہ سکتا ہے۔"

"آپ ہم سے نہ بولیں۔ ہمارا بیٹا اسپتال سے آنے کے بعد آپ کے کالج میں نہیں پڑھے گا۔"

"بدیع الزماں نے آپ سے کہا ہو گا کہ بیٹے سے میرا کالج چھڑا دیں۔"

"ہاں۔ کہا ہے۔ ہمارے محسن صاحب آپ سے بھی بڑے کالج میں ہمارے بیٹے کو پڑھاتے رہیں گے۔"

"وہ ضرور پڑھائیں گے۔ آخر آپ کے بیٹے سے ان کے بیٹے کو بھی فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔"

صابرہ نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تم کچھ نہ بولو۔ محسن صاحب نے تاکید کی تھی' ہمیں کسی کے سامنے جیادہ نہیں بولنا چاہیے۔"

وہ اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ آئی جی نے کہا۔ "خان صاحب! آپ کا یہ اندازہ درست لگتا ہے کہ بدیع الزماں فہیم کی ذہانت سے اپنے بیٹے کے لیے فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

خان اعظم خان نے کہا۔ "فہیم اور اس کے ماں باپ شریف ہیں مگر نادان ہیں۔ ایماندار بھی ہیں مگر بدیع الزماں کو فرشتہ سمجھ کر گمراہ ہو رہے ہیں۔"

وہ سب اس حد تک اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ بدیع الزماں نے فہیم کی ذہانت خرید لی ہے لیکن اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ قانون کی نظروں میں فہیم اس بات کا مجرم تھا کہ اس نے رئیس الزماں اور فہیم الزماں کے دو ناموں سے شناختی کارڈز کیوں بنائے تھے۔ فہیم کا یہ عمل سراسر غیر قانونی تھا اور اس طرح وہ فراڈ ثابت ہو رہا تھا۔

☆=========☆=========☆

آدھی رات گزر چکی تھی۔ کرن چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ کروٹیں بدل کر کبھی فہیم

کے اور کبھی اپنی ماں اور ماموں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ فہیم اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا پھر رہا ہو گا۔ اس کے ماموں عبیدالرحمان تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکے ہوں گے۔ اس طرح پولیس والے بھی اسے تلاش کر رہے ہوں گے پتا نہیں اسے شہر سے کتنی دور لا کر رکھا گیا تھا۔ تلاش کرنے والے وہاں تک......... پہنچ پاتے یا نہیں۔

اس علاقے میں رات کی تاریکی پھیلتے ہی گہری خاموشی اور سناٹا چھا جاتا تھا۔ ایسی ویرانی ہوتی تھی کہ نزدیک یا دور سے کسی آدمی تو کیا' کتے بلی کی آوازیں بھی نہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس مکان کی چار دیواری کے اندر اس موٹی اور تگڑی عورت کے خراٹے ابھرتے رہتے تھے۔ ایک چارپائی پر وہ اپنے بچے کے ساتھ گہری نیند سوتی رہتی تھی لیکن دوسرے کمرے میں اس کا شوہر گن مین جاگتا رہتا تھا۔ وہ دن کو چند گھنٹے کے لیے سوتا تو وہ موٹی جاگ کر اس کا پستول لے کر کرن پر کڑی نظر رکھتی تھی۔

اس رات کرن جاگ رہی تھی۔ کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں کمروں کے درمیانی دروازے سے گن مین اسے دیکھ رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ وہ دوبارہ لیٹ کر سو جائے گی پھر صبح تک سوتی رہے گی لیکن وہ بستر سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

گن مین بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا' سخت لہجے میں بولا۔ "اے سوتی کیوں نہیں؟"

کرن نے کہا۔ "نیند آئے گی تو سو جاؤں گی۔"

"اچھا تو تجھے نیند نہیں آ رہی ہے؟ مگر یہ بستر سے اٹھ کر کہاں جا رہی ہے؟"

"میں کہاں جاؤں گی۔ تم لوگ مجھے باہر جانے نہیں دیتے۔ کچن میں تو جا سکتی ہوں؟"

"کچن میں جا کر کیا کرے گی؟"

"پانی پیوں گی۔ مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

"تو پھر جلدی جا اور پانی پی کر آ۔ جب تک جاگتی رہتی ہے' تیری طرف منہ کر کے بیٹھنا پڑتا ہے۔"

وہ آگے بڑھ کر کچن کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ ایک گلاس میں پانی لیتے ہوئے

دروازے کی طرف دیکھا۔ گن مین نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا تھا اسے یقین تھا کہ وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکے گی۔ باہر جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا اور اس دروازے کے سامنے وہ چارپائی بچھا کر گن لیے بیٹھا رہتا تھا۔

اس نے کچن میں آ کر گلاس میں پانی کے دو گھونٹ پیئے پھر ایک بار دروازے کی طرف دیکھا۔ گن مین نہیں تھا۔ اس نے فوراً ہی دونوں گیس کے چولھوں کی چابیاں گھما کر انہیں کھول دیا پھر ماچس کی ڈبیا اٹھا کر اپنے گریبان میں چھپا کر کمرے میں واپس آ گئی۔ گن مین اسے دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔ وہ پہلے اپنی چارپائی پر بیٹھی پھر لیٹ گئی۔

اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آج اس نے فرار ہونے کا یا جان پر کھیل جانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اب مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے گیس کی بو محسوس کی۔ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گریبان سے ماچس کی ڈبیا نکال کر مٹھی میں چھپا لی۔ وہ ڈانٹ کر بولا۔ "تُو پھر اٹھ گئی؟ اور یہ......... یہ بُو کیسی ہے؟"

وہ فوراً اپنی چارپائی سے دوڑ کر دوسری چارپائی کے پاس آئی۔ ننھے سے بچے کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا۔ بچہ بیدار ہو کر رونے لگا تو عورت کی آنکھ کھل گئی۔ عورت نے چیخ کر پوچھا۔ "اے میرے بچے کو کہاں لے جا رہی ہے؟"

کرن نے کچن کے دروازے پر پہنچتے ہی ماچس کی تیلی جلا کر کچن کے اندر پھینک دی۔ ایک دم سے آگ بھڑک اٹھی۔ وہ چیخ کر بولی۔ "خبردار! میرے قریب نہ آنا ورنہ بچے کے ساتھ آگ میں کود جاؤں گی۔"

موٹی عورت نے روتے ہوئے کہا۔ "ہائے میرا بچہ! ارے او رحیم کے ابا جلدی آ۔ یہ میرے بچے کو جلا ڈالے گی۔"

گن مین اپنی بیوی کے پاس پہنچ گیا لیکن آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ کچن میں آگ پھیل رہی تھی اور کرن کہہ رہی تھی۔ "تم میں سے کوئی میرے قریب آئے گا تو میں بچے کے ساتھ آگ میں کود جاؤں گی۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "اری او پاگل کی بچی! میرے بچے کے ساتھ تُو بھی جل جائے

گی۔"

"ہاں میں جل جاؤں گی۔ اپنی عزت لٹنے سے پہلے مرجاؤں گی۔ تو بول اپنے بچے کو زندہ دیکھنا چاہتی ہے یا مُردہ؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "میرے بیٹے کو چھوڑ دے۔ میں تجھے چھوڑ دوں گی۔ تجھے یہاں سے جانے دوں گی۔"

"ایسے نہیں۔ پہلے اپنے آدمی سے بول اپنا پستول میرے پاس پھینک دے اور اپنی رائفل خالی کر دے۔"

گن مین نے گرج کر کہا۔ "میں تجھے گولی مار کر اپنا بچہ چھین لوں گا۔"

"تو ایک قدم بھی آگے بڑھے گا تو میں آگ میں کود جاؤں گی۔ دیکھ یہ آگ تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ میری بات نہیں مانے گا تو میں تیرے بچے کے ساتھ مُردہ ملوں گی۔"

موٹی عورت نے اپنے میاں کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ "ارے مالک کے کتے! میرا بچہ جل جائے گا۔ اسے جلدی سے پستول دے دے۔"

آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ گن مین نے اپنا پستول کرن کے قدموں کے پاس پھینک دیا۔ کرن نے جھک کر اسے اٹھایا اور چیک کیا۔ وہ پوری طرح لوڈ تھا۔ گن مین نے اپنی رائفل خالی کر کے ایک طرف پھینک دی۔ کرن نے پستول کی نال کو بچے کے سر سے لگا کر کہا۔ "ہٹ جاؤ۔ مجھے جانے کا راستہ دو۔ باہر کا دروازہ کھولو۔"

وہ میاں بیوی اس کے احکامات کی تعمیل کرنے لگے۔ کرن بچے کو ایک ہاتھ سے تھام کر اسے سینے سے لگائے کچن کی طرف سے آگئی.......... آگ اب پھیلتی ہوئی دوسرے کمرے میں آرہی تھی۔ وہ سامنے والے کمرے میں آکر بولی۔ "تم دونوں کوئی چالاکی دکھاؤ گے‘ میرے قریب آکر بچے کو چھیننا چاہو گے تو میں اسے گولی مار دوں گی۔ چلو باہر نکلو اور میرے آگے آگے چلتے رہو۔"

وہ اس مکان سے باہر آگئے۔ کرن سے تھوڑا فاصلہ رکھتے ہوئے آگے چلنے لگے۔ وہ بولی۔ "مجھے بتاتے جاؤ‘ یہ کون سی جگہ ہے اور یہاں قریب جو تھانہ ہے‘ وہاں مجھے لے

چلو۔"

موٹی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تم جو کہہ رہی ہو‘ وہ ہم کرتے جا رہے ہیں۔ میرا بچہ مجھے دے دو۔ وہ رو رہا ہے۔"

"میری امی بھی میرے لیے رو رہی ہوں گی۔ ظلم کرتی ہو تو رونے کی آوازیں بھی برداشت کرنا سیکھو اور تیزی سے چلتے رہو۔"

وہ اور تیزی سے چلنے لگے۔ اب اس فارم ہاؤس والے مکان میں پوری طرح آگ لگ چکی تھی۔ رات کی تاریکی میں اس کے بھڑکتے ہوئے شعلے دور سے نظر آرہے تھے۔

گن مین نے کہا۔ "ہم اپنے بچے کی خاطر تمہاری باتیں مان رہے ہیں مگر تم اپنے لیے برا کر رہی ہو۔ ہمارے صاحب کے آدمی آئیں گے تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں قیدی بن کر رہتی تب بھی مجھے زندہ نہیں چھوڑا جاتا۔ وہ مجھے چھوڑ دیتے تو میں خودکشی کر لیتی مگر واپس جا کر اپنے خاندان والوں کو منہ نہ دکھاتی۔ یہ بتاؤ تمہارا صاحب کون ہے؟"

"ایسی بات نہ پوچھو جس کا جواب ہم نہ دے سکیں۔ ہمیں سختی سے منع کیا گیا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "موٹی! کیا تو اپنے بچے کی زندگی نہیں چاہتی؟ کیا میں اسے اور تیرے مرد کو گولی مار دوں؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "نہیں نہیں۔ اس معصوم کو نہ مار۔ اللہ تجھے عزت سے رکھے گا.......... رحیم کے ابا! یہ جو پوچھتی ہے‘ بتا دے نہیں تو میں تجھ کو جان سے مار دوں گی۔ اپنے بچے کو مرنے نہیں دوں گی۔"

گن مین نے ذرا رک کر کہا۔ "ہمارے بڑے صاحب کا نام بدیع الزماں ہے۔"

کرن نے ڈانٹ کر کہا۔ "قدم نہ روکو۔ تیزی سے چلتے ہوئے بولو۔ بدیع الزماں نے مجھے کیوں قید کیا ہے؟"

"ان کے بیٹے کے حکم سے تمہیں چار آدمی یہاں لائے تھے۔ چھوٹے رئیس الزماں نے ہمیں جو حکم دیا تھا‘ ہم وہی کر رہے تھے۔"

"یہ کون سا علاقہ ہے؟"

"یہاں دور دور تک بڑے صاحب کی زمینیں ہیں۔ آگے موہن جو گوٹھ ہے۔ وہیں ایک تھانہ ہے۔"

"تو پھر راستہ بدل دو۔ میں اس تھانے میں نہیں جاؤں گی۔ یہاں علاقوں کے تھانے دار وڈیروں اور زمیں داروں کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔ میں وہاں جاؤں گی تو وہاں کا تھانے دار ان باپ بیٹے کے خلاف کارروائی نہیں کرے گا۔ میں کہتی ہوں' راستہ بدلو۔ دوسری طرف چلو۔ میں بار بار دھمکیاں نہیں دوں گی' گولی مار دوں گی۔"

وہ راستہ بدل کر چلنے لگے۔ کرن یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ رہائی حاصل کرنے کے باوجود اب تک دشمنوں کی زمین پر چل رہی ہے۔ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر رئیس الزماں کے آدمی پھر اسے پکڑنے کے لیے آسکتے تھے۔ اگرچہ اب وہ جلتا ہوا مکان نظر نہیں آرہا تھا۔ تاریکی میں صرف آگ کی روشنی جھلک رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ بہت دور نکل آئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "شہر یہاں سے کتنا دور ہے؟"

وہ بولا۔ "چالیس کلومیٹر دور تھا۔ اب راستہ بدل کر جا رہے ہیں۔ پتا نہیں آگے کتنی دور جانا پڑے۔"

"تم لوگ یہاں کے رہنے والے ہو۔ یہاں کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ مجھے کسی بھی بڑی سڑک تک پہنچا دو جہاں سے گاڑیاں گزرتی ہیں۔"

گن مین نے کہا۔ "ہم اسی طرف جا رہے ہیں لیکن بہت دور تک چلنا ہوگا۔"

"میں ساری زندگی چلتی رہوں گی اور تمہیں چلاتی رہوں گی اور تم سنو موٹی! میں نے تم سے پوچھا تھا۔ اگر کبھی تمہاری جوان بیٹی کو اغوا کیا گیا تو تم کیا کرو گی؟ اور تم نے جواب دیا تھا۔ جب ایسا وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی تو تمہیں تگڑی رقم مل رہی ہے۔ اب وقت تم پر آیا ہے۔ تمہارے ننھے سے بیٹے کو میں اغوا کر رہی ہوں۔ ہر لمحہ موت اس بچے کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اب اپنے شکار کرنے اور گولیاں چلانے والے مرد سے پوچھو کہ یہ اپنے بچے کی زندگی کیسے بچائے گا؟"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "ہم اس کی زندگی بچانے کے لیے تمہاری ہر بات مانتے رہیں

گے اور تم دیکھ رہی ہو کہ ہم لوگ آگے آگے ہیں۔ تم سے دور ہیں۔ کوئی چالاکی نہیں دکھا رہے ہیں۔"

پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "ہائے! مجھ پر پڑی ہے تو سمجھ رہی ہوں' اولاد کی محبت کیا ہوتی ہے۔ تمہاری ماں بھی تمہارے لیے رو رہی ہوگی۔ میں کان پکڑتی ہوں۔ توبہ کرتی ہوں پھر کبھی کسی کا گھر نہیں اجاڑوں گی۔"

بچہ بڑی دیر سے خاموش تھا پھر رونے لگا۔ ماں نے تڑپ کر کہا۔ "اسے میری گود میں دے دو۔ یہ ماں کی گود کی گرمی پہچانتا ہے۔"

"گرمی گود کی نہیں ہوتی' ممتا کی اور محبت کی گرمی ہوتی ہے۔ تم میری دشمن ہو لیکن میں نے اسے بڑی محبت سے سینے سے لگا رکھا ہے۔"

"پھر یہ کیوں رو رہا ہے؟ تم سہاگن نہیں ہو۔ ماں نہیں ہو' بچے کو نہیں سمجھ رہی ہو۔"

"موت کو سمجھنے کے لیے مرنا ضروری نہیں ہوتا۔ علم کی روشنی میں مطالعے اور مشاہدے سے ساری باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ابھی تمہارا بچہ بھوک سے رو رہا ہے۔"

"اللہ تمہیں نیکی دے۔ مجھے اسے دودھ پلانے دو۔"

"دودھ پلانے کے لیے رکنا ہوگا اور میں دشمن کی زمین پر رکنا نہیں چاہتی۔"

گن مین نے کہا۔ "بڑے صاحب کی زمینیں پیچھے رہ گئی ہیں۔ یہاں تمہارے لیے خطرہ نہیں ہے۔"

ماں نے کہا۔ "ظالم نہ بنو۔ میرا بچہ بھوک سے بلک رہا ہے۔"

"تو پھر تیزی دکھاؤ۔ جلدی سے کسی سڑک پر پہنچو۔"

وہ دوڑنے کے انداز میں تیز قدموں سے چلنے لگے۔ بچہ چپ نہیں ہو رہا تھا' روتا جا رہا تھا۔ کرن کو اس پر ترس آگیا۔ وہ بولی۔ "رک جاؤ۔"

وہ دونوں رک گئے۔ کرن نے کہا۔ "میرا دل نہیں مانتا کہ یہ ننھا بھوک سے بلکتا رہے۔ میں جیسا کہوں' ویسا کرو۔ میں بچہ دے رہی ہوں لیکن میری طرف منہ کرکے اسے

دودھ پلاؤ۔ اگر ذرا بھی گھوم کر بھاگنے کی کوشش کی تو اس سے پہلے ہی میں بچے کو گولی مار دوں گی۔"

اس نے جھک کر بچے کو زمین پر رکھا پھر اسے نشانے پر رکھتے ہوئے پیچھے کئی قدم چلی گئی۔ ماں نے آگے بڑھ کر بچے کو زمین سے اٹھالیا پھر وہیں بیٹھ کر اسے سینے سے لگا کر دودھ پلانے لگی۔

اس بچے کو موت کی چھاؤں میں خوراک مل رہی تھی۔ وہ پستول کے نشانے پر تھا۔

☆=========☆=========☆

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ رات کے تین بجے سب گہری نیند میں ہوتے ہیں۔ اس وقت گھنٹی کی آواز پہلے تو سنائی نہیں دیتی پھر سنائی دے تو آنکھیں کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ ٹیلی فون بدیع الزماں کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ وہ نیند سے کسمسا رہا تھا۔ فون ریسیو کرنا نہیں چاہتا تھا۔

بیگم نے اسے جھنجوڑ کر کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔ میری نیند خراب ہو رہی ہے۔ دیکھ تو لیں کہ اتنی رات کو کسے موت آرہی ہے۔"

بدیع الزماں نے مجبور ہو کر بیزاری سے ریسیور اٹھایا پھر اسے کان سے لگا کر کہا۔ "کیا مصیبت ہے؟ کسی کی نیند کا تو خیال کیا کرو۔ کون ہو تم؟"

دوسری طرف سے ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ "جناب! بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ فارم ہاؤس والے مکان میں آگ لگ گئی ہے۔"

بدیع الزماں کی نیند اڑ گئی۔ وہ فوراً ہی بیٹھتے ہوئے بولا۔ "وہاں اس لڑکی کو چھپا کر رکھا گیا تھا۔ آگ کیسے لگ گئی؟ لڑکی اور پہرے دار کہاں ہیں؟"

"کسی کا پتا نہیں ہے جناب!"

"کیا وہ سب جل کر مر گئے؟"

"نہیں جناب! کسی کی بھی جلی ہوئی لاش نظر نہیں آئی ہے۔ وہ مکان جل کر کھنڈر بن گیا ہے۔ کوئی سامان بھی نہیں بچا۔ پتا نہیں، وہ تینوں اور ان کا بچہ کہاں گئے؟"

"انہیں تلاش کرنا چاہیے تھا۔"

"ہم سمجھ رہے تھے، وہ سب جل کر مر گئے تھے۔ جب آگ بجھا دی گئی تب پتا چلا کہ ان میں سے نہ کوئی جلا ہے، نہ مرا ہے۔"

"مجھے فون کرنے سے پہلے دور تک جا کر انہیں تلاش کرنا چاہیے تھا۔"

"ہمارے آدمی جیپ میں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے ہیں۔ اگر وہ جان بچا کر بھاگ رہے ہیں تو ان کے پاس کوئی گاڑی نہیں ہے، پکڑے جائیں گے۔"

"ہمارا وہ گن مین نمک حرام نہیں تھا پھر وہ اپنی بیوی بچے اور اس لڑکی کے ساتھ کہاں چلا گیا ہے؟"

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا جناب! آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ آپ موہن جو گوٹھ کے تھانے دار سے رابطہ کریں۔ شاید گن مین اس فرار ہونے والی لڑکی کا پیچھا کرتا ہوا تھانے کی طرف گیا ہو۔"

"ہاں۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں ابھی موہن جو گوٹھ کے تھانے دار سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے ریسیور رکھ کر بیگم سے کہا۔ "یہ ہمارے صاحب زادے نئے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ وہ لڑکی فرار ہو گئی تو ہمیں خود کو الزامات سے بچانے کے لیے بڑی مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔"

"آپ بیٹے پر بعد میں بھی غصہ دکھا سکتے ہیں۔ پہلے اس تھانے دار سے بات کریں۔"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اسی وقت بیڈ روم کے دروازے پر دستک سنائی دی۔ بیگم نے بستر سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"ممی! میں ہوں آپ کا بیٹا۔ دروازہ کھولیں اور ڈیڈ کو جگائیں۔ بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔"

اس نے تیزی سے آکر دروازہ کھولا پھر بولی۔ "کیا تمہیں بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ لڑکی کہیں بھاگ گئی ہے؟"

"ہاں، فارم ہاؤس سے فون آیا تھا کہ وہاں کے مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ بالکل

جل چکا ہے لیکن وہاں سے کسی بندے کی لاش نہیں ملی ہے۔"

بدیع الزماں نے ریسیور رکھ کر کہا۔ "تھانے دار کہہ رہا ہے کہ اس کے تھانے میں نہ کرن نام کی کوئی لڑکی آئی ہے اور نہ ہمارا کوئی وفادار اس لڑکی کی تلاش میں تھانے آیا ہے۔"

رئیس الزماں نے کہا۔ "میرے کئی گھڑسوار اس کی تلاش میں گئے ہیں۔ وہ ضرور پکڑی جائے گی۔ ہم سے بچ کر نہیں جاسکے گی۔"

باپ نے غصے سے کہا۔ "تم تصویر کا دوسرا رخ کیوں نہیں دیکھتے؟ اگر وہ نہ پکڑی گئی اور یہاں کے کسی بڑے پولیس افسر کے پاس پہنچ گئی تب کیا ہو گا؟"

"او ڈیڈ! آپ مصیبت آنے سے پہلے فکر مند ہو جاتے ہیں۔ کرن کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ ہمارے پاس گاڑیاں اور گھوڑے بہت ہیں۔ وہ اندھیری رات میں اتنی دور شہر تک نہیں پہنچ سکے گی۔"

"اللہ کرے' وہ شہر واپس نہ جاسکے مگر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ وہ شہر پہنچ گئی تو کیا ہو گا؟ اگر اس نے گن مین سے یا اس کی بیوی سے ہمارا نام معلوم کرلیا تو کیا ہو گا؟"

"ان میاں بیوی کو سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ کرن کے سامنے کبھی ہمارا نام نہ لیں۔"

"وہ میاں بیوی اور ان کا بچہ بھی نہیں ہے۔ جہاں تک فرار ہونے کا تعلق ہے تو کرن موقع پاکر فرار ہو گئی لیکن وہ پہرے دار میاں بیوی کہاں گئے؟"

"بس یہی بات سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ وہ گن مین بہت وفادار ہے۔ ہم سے دغا نہیں کرے گا۔ فی الحال تو یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ میاں بیوی کرن کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔"

باپ نے گرج کر بیٹے سے کہا۔ "جہنم میں گئے وہ لوگ لیکن میری نیند.......... تو اُڑ گئی ہے نا۔ میری مشکلات تو بڑھ گئی ہیں۔ میں کون سا حربہ استعمال کروں کہ وہ لڑکی خان اعظم خان اور مجھ سے مخالفت رکھنے والے افسران تک نہ پہنچ سکے۔"

"ڈیڈ! آپ مجھ پر کیوں گرج رہے ہیں؟"

"یہ تمہارا کیا دھرا ہے۔ کیا ضرورت تھی.......... انتقام لینے کے لیے ایک دو کوڑی کی لڑکی کو اغوا کرنے کی؟ اگر اس نے تمہاری توہین کی تھی تو اسے غنڈوں بدمعاشوں کے حوالے کر دیتے۔ اسے ہمارے فارم ہاؤس میں پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"جب میں نے ایسا کیا تب تو آپ نے کہا تھا' ٹھیک ہے کرن کو اغوا کر کے ہم فہیم کے لیے مصیبتیں کھڑی کر دیں گے۔ سیدھی سی بات ہے' آپ نے فہیم کو اپاہج بنانا چاہا اور میں نے کرن کا منہ کالا کرنا چاہا مگر اس کے فرار ہونے سے بات بگڑ گئی ہے۔ آپ بھی فہیم کے معاملے میں کچھ کمزور ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھے تو یہ سوچ کر شرم آرہی ہے کہ خان اعظم خان آپ سے زیادہ ذرائع کا مالک ہے۔ کیا آپ اس کا سر نہیں کچل سکتے؟"

"میں بہت کچھ کر سکتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میرے لیے نئے مسائل پیدا نہ کرو۔ جاؤ بیٹے! اب بستر چھوڑ دو۔ سونا بھول جاؤ۔ اپنے تابع داروں سے کہو کہ وہ لڑکی جہاں بھی نظر آئے' وہیں اسے گولی مار دیں۔"

بیگم نے پوچھا۔ "اس مکان میں آگ کیسے لگ گئی؟"

"میں یہاں بیٹھے بیٹھے کیسے بتاؤں؟ جو بندے رپورٹ دے رہے ہیں' وہ بھی نہیں جانتے کہ آگ کیسے لگ گئی۔"

"میں قسمت کو مانتی ہوں' آپ نہیں مانتے۔ کہتے ہیں' جو قسمت کی لکیریں ہیں' یہ ہماری مٹھی میں ہیں۔ ہم اپنی ذہانت اور زورِ بازو سے اپنی قسمت بناتے ہیں مگر آپ بنا کہاں رہے ہیں؟ آپ کی قسمت تو بگڑ رہی ہے۔ خان اعظم خان جیسا شخص فہیم کا حامی بن گیا ہے اور اس لڑکی کے فرار ہونے کے لیے اچانک فارم ہاؤس کے مکان میں آگ لگ گئی ہے۔ حالات آپ کے خلاف ہیں۔ جلدی کچھ کریں ورنہ ہم سوسائٹی میں جو برتری حاصل کرتے رہے ہیں اور اپنے بیٹے کی تعلیمی صلاحیتوں کا جو ڈنکا بجاتے رہے ہیں' وہ سارا جھوٹ اور فریب سامنے آجائے گا۔"

وہ بولا۔ "ہمارے سامنے بحث کرنے کے لیے بہت سے مسائل ہیں لیکن ہمیں پہلے ایک بنیادی مسئلے کو حل کرنا ہو گا اور وہ مسئلہ کرن کا ہے۔ اسے کسی حال میں بھی شہر نہیں پہنچنا چاہیے۔ اس کی موت سے ہمارے بہت سے رازوں پر پردہ پڑ جائے گا۔ وہ بیان نہیں

دے پائے گی کہ اسے فہیم نے نہیں‘ ہمارے بیٹے رئیس الزماں نے اغوا کیا تھا۔“

رئیس الزماں فون پر باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ریسیور رکھ کر کہا۔ ”ہمارے دو درجن گھڑسوار مختلف سمتوں پر نکل پڑے ہیں۔ وہ جس راستے سے جائے گی پکڑی جائے گی اور اسی لمحے مار ڈالی جائے گی۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ فارم ہاؤس میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ وہ پیدل گئی ہو گی آخر کتنی دور جاسکے گی۔“

یہ بدیع الزماں کہہ رہا تھا کہ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ آدمی عجیب ہوتا ہے۔ غلط کام کے لیے بھی اللہ کی رضا چاہتا ہے۔ بیٹے نے کہا۔ ”اللہ ضرور ایسا کرے گا‘ جس کے پاس دولت اور طاقت ہوتی ہے‘ اللہ اسی کا مقدر بناتا ہے۔“

فجر کی اذان ہونے لگی۔ وہ بولا۔ ”میری بات سچی ہے۔ سچ بولتے ہی اذان ہو گئی۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بولا۔ ”میں ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں۔ وہاں کام کے کچھ بندوں کو بلایا ہے۔ ملازم کو جگاتا ہوں‘ وہ ہمارے لیے چائے بنائے گا۔“

وہ بیڈ روم سے چلا گیا۔ بیگم نے کہا۔ ”واقعی نیند اڑ گئی ہے ایسی پریشانیوں میں پتا بھی نہیں چلا کہ رات گزر چکی ہے اور فجر کی اذان بھی ہو رہی ہے۔ آپ چائے کے ساتھ کچھ کھائیں گے؟“

”ابھی تو پریشانیاں مجھے کھا رہی ہیں۔ فی الحال چائے کافی ہے۔“

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ریسیور اٹھا کر بولا۔ ”ہیلو کون ہے؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”جناب! ہم نے کرن نامی لڑکی کو ختم کر دیا ہے۔ اسے گولی مار دی ہے۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”شاباش۔ ویسے گولی مارنے سے پہلے کرن کو پہچان لیا تھا؟“

”یہ تو آپ جانتے ہیں۔ میں اور میرے ساتھی نے کرن کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔ ہم اسے صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ ہم نے نیشنل ہائی وے پر ایک کار کو روکا تھا۔ اس میں میاں بیوی.......... اور ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ لڑکی کار کے رکتے ہی دروازہ کھول کر بھاگنے لگی۔ ان میاں بیوی نے اسے آواز دی .... کرن! رک جاؤ۔ رک جاؤ کرن..........

”وہ جس انداز سے دروازہ کھول کر بھاگ رہی تھی اسی انداز سے پتا چل گیا کہ وہی ہماری مطلوبہ شکار ہے پھر وہ میاں بیوی اس لڑکی کو بار بار کرن کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ بہرحال وہ.......... مر چکی ہے۔ کیا آپ اس کی لاش دیکھنا چاہیں گے؟“

”ہمارا ادھر جانا مناسب نہیں ہے۔ تم اس کی لاش کی چند تصاویر اتار کر لے آؤ۔ میرے بیٹے نے اسے قریب سے دیکھا ہے‘ پہچان لے گا۔“

اس کے تابعدار نے کہا وہ تصاویر اتار کر انہیں ڈیولیپ اور پرنٹ کر کے آج ہی لے آئے گا۔

بدیع الزماں نے ریسیور رکھ کر بیگم سے کہا۔ ”ہمارے راستے کا کانٹا صاف ہو گیا۔ ہمارے آدمیوں نے کرن کو گولی مار دی ہے۔“

بیگم نے کہا۔ ”یا اللہ تیرا شکر ہے۔ آدھی مصیبت تو دور ہوئی۔ اب میرے بیٹے پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔“

بیگم بھی آخر مسلمان تھی۔ ایک لڑکی کو قتل کرانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ایسے ادا کیا جیسے قتل و غارت گری اور ان کے دوسرے منافع بخش جرائم میں اللہ تعالیٰ ہی ان کی مدد کرتا ہے۔ یہ عجیب سی بات ہے‘ آدمی خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو‘ برے ارادوں میں کامیاب ہونے کے بعد شیطان کا شکریہ ادا نہیں کرتا۔ آج تک یہ نہیں سنا ”اے شیطان! تُو نے مصائب دور کیے ہیں عذابوں سے نجات دلائی ہے۔ عزت برقرار رکھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ منافع اور عروج دے رہا ہے۔ تیرا شکریہ!“

افسوس‘ بے چارہ شیطان اتنے کارنامے انجام دینے کے باوجود ایک چھوٹے سے لفظ ”شکریہ“ سے محروم رہتا ہے۔ بے چارے کے بندے اس کا سارا کریڈٹ اللہ میاں کو دیتے ہیں۔

☆========☆========☆

ایک ہی نام صرف دو بندوں کا نہیں‘ دو ہزار اور دو لاکھ بندوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ ایک اور طالبہ کا نام کرن تھا۔ ایک کرن خورشید‘ دوسری کرن ماہتاب تھی۔ بہت ہی ذہین

تھی اور ہر جماعت میں اول آتی تھی۔ فہیم الزماں سے ایک برس پہلے بورڈ کے امتحانات کے نتائج کا اعلان ہوا تو پورے صوبے میں اول آئی تھی۔

کرن ماہتاب کا بڑا بھائی مراد اکبر تھا۔ اس نے بھی بی اے تک تعلیم حاصل کی تھی لیکن تعلیمی ذہانت بس اتنی ہی تھی کہ وہ پاسنگ مارکس حاصل کرتا رہا تھا۔ ملازمتیں انہیں بھی نہیں ملتیں' جو نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ مراد اکبر بڑی یا چھوٹی ملازمتوں کے لیے دھکے کھاتا رہا۔ باپ ملازمت سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ گھر کا چولھا جلانے کے لیے جو آمدنی تھی' وہ نہ رہی۔ کتاب اور قلم کا بوجھ اٹھانے والے بی اے پاس مراد اکبر نے اینٹ......... پتھر اٹھانے اور گٹر کھودنے کی مزدوری کی لیکن بڑھتی ہوئی مہنگائی اس کی محنت مزدوری سے زیادہ وزنی ہوتی گئی۔ پھر اسے کچھ ایسے ساتھی ملے جو زیادہ کمانے کے لیے اپنے راستوں پر لے گئے۔ ان راستوں پر پہلے چوری اور ہیرا پھیری تھی۔ اس میں اچھی کمائی تھی مگر مسلسل نہیں تھی۔ کبھی وارے نیارے ہو جاتے تھے' کبھی وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا رہ جاتا تھا۔

اس دوران میں ایک امیر خاندان میں اس کی بہن کرن ماہتاب کی پذیرائی ہوئی۔ اس خاندان کے رئیس اعظم جمشید کامران کی بیٹی ارم کامران تعلیم میں کمزور تھی۔ اپنی بیٹی کو بڑی بڑی سندیں دلانے اور خاندان کی دوسری تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں سے برتر رکھنے کے لیے جمشید کامران نے کرن ماہتاب کی خدمات حاصل کیں۔ پہلے تو اس نے کرن ماہتاب جیسی غریب لڑکی سے ملنا بھی گوارا نہ کیا۔ اس کی بیگم نے کرن سے معاملات طے کیے......... اور اس سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی ارم کامران کو بورڈ کے امتحانات میں نمایاں کامیابی دلائے گی تو اسے ماہانہ تنخواہ کے علاوہ دس ہزار روپیہ انعام دے گی۔

کرن نے اس رئیس زادی کو اے ون گریڈ دلایا۔ پورے خاندان میں اس رئیس زادی کی واہ واہ ہونے لگی۔ بیگم نے خوش ہو کر اپنے میاں جمشید کامران سے کہا۔ "میں نے کرن ماہتاب سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہماری بیٹی کو نمایاں پوزیشن دلائے گی تو میں اسے دس ہزار روپے انعام میں دوں گی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ لڑکی ہماری بیٹی کے لیے اے ون گریڈ لائے گی۔ ہمارے خاندان کی ساری لڑکیاں پیچھے رہ گئی ہیں۔"

جمشید کامران نے کہا۔ "اس لڑکی نے واقعی ہمارا سربلند کیا ہے۔ وہ دس ہزار روپے سے زیادہ کی حق دار ہے۔ اسے بلاؤ' میں اسے انعام دوں گا۔"

جمشید کامران اپنے باپ دادا کی پرانی حویلی میں رہتا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور جاگیرداری کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی رعایا کے تمام ووٹ سمیٹ کر اسمبلی تک پہنچتا رہتا تھا۔ شہر میں ایک عالی شان کوٹھی تھی' جس میں اس کی بیگم اور بیٹی ارم رہا کرتی تھیں۔ وہ ضرورت کے وقت آیا کرتا تھا پھر حویلی میں واپس چلا جایا کرتا تھا۔

جب کرن ماہتاب انعام لینے کے لیے کوٹھی میں آئی تو جمشید کامران اسے دیکھتے ہی پھر سے جوان ہو گیا۔ اس نے اپنی بیگم سے کہا۔ "ہماری بیٹی ذہین ہے لیکن تعلیم سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ ایک دن ہمارے بعد اسے بھی اسمبلی میں پہنچنا ہے۔ لہٰذا اس پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا لیبل لگانا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ کرن ماہتاب ہمارے کام آتی رہے گی۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ نے اچھی بات سوچی ہے۔ لڑکی غریب ہے۔ اس کا جوان بڑا بھائی ہے' وہ بھی بے روزگار ہے۔ ہم لڑکی کی ماہانہ تنخواہ کچھ بڑھا دیں گے اور وہ ہماری بیٹی کے لیے پڑھتی رہے گی اور بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرتی رہے گی۔"

جمشید کامران نے ڈرائنگ روم میں آکر کرن ماہتاب کو بیس ہزار روپے انعام کے طور پر دیئے۔ وہ حیران ہو کر بولی۔ "یہ تو بہت ہیں۔ بیگم صاحبہ نے دس ہزار کے لیے کہا تھا۔"

وہ بولا۔ "تم ایک انمول ہیرا ہو۔ تمہاری قیمت اس سے بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ تمہیں آئندہ بہت کچھ ملنے والا ہے۔ اس سلسلے میں بیگم تم سے معاملات طے کر لیں گی۔"

اس نے اپنی بیگم کے سامنے اس سے زیادہ بات نہیں کی لیکن کوٹھی کے باہر آکر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اپنے کمدار سے بولا۔ "میں حویلی جا رہا ہوں۔ کرن پر نظر رکھو۔ جتنی جلدی ہو سکے' اسے حویلی پہنچا دو۔"

کرن ماہتاب اس کوٹھی سے نکلی تو بہت خوش تھی۔ اسے برسوں تک اپنے لیے اور رئیس زادی ارم کامران کے لیے تعلیم جاری رکھنے کی ملازمت مل گئی تھی۔ اسے ہر ماہ

چار ہزار روپے ملنے والے تھے۔

بڑے بھائی مراد اکبر کو شرم آرہی تھی کہ بہن نے اپنی ذہانت سے گھر والوں کی سفید پوشی کا بھرم رکھا ہے اور وہ مرد ہو کر اپنی ذہانت اور قوتِ بازو سے بھی بہن کے برابر کما نہیں سکتا۔ اس بات کا یقین تھا کہ اسے کبھی کہیں کوئی ملازمت نہیں مل سکے گی۔ غلط راستے سے اتنا ہی کما سکتا تھا کہ اسے نکما ہونے کا طعنہ نہیں دیا جاتا تھا۔ گھر والے بڑھتی ہوئی مہنگائی اور بے روزگاری کے پیشِ نظر اس کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے تھے۔

لیکن وہ بہن کے مقابلے میں بے بس اور مجبور کہلانا نہیں چاہتا تھا۔ دلدل میں پاؤں رکھو تو آدمی اس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ غلط اور ناجائز طریقے ہمیشہ دلدل کی طرف لے جاتے ہیں۔ وہ معمولی ہیرا پھیری کرتے کرتے ڈرگ مافیا کے زیرِ اثر آگیا۔ وہاں سے پھسلتے ہوئے ہتھیار.......... اٹھا کر دہشت گردی کی طرف چل نکلا۔ موجودہ دور کے اس نئے دھندے میں طاقت کا مظاہرہ اور مردانگی بھی ہے اور کمائی بھی۔

ہر انسان کو اچھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔ اگر اچھی زندگی نہ گزار سکے تو بری ہی سہی۔ آدمی اپنی موت سے پہلے مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی ایک بار ملتی ہے۔ وہ جینا چاہتا ہے۔ جیسے بھی ہو' جینا چاہتا ہے۔ اپنی زندگی دوسروں کے اختیار میں ہو تو ان سے اپنا حق مانگتا ہے۔ حق نہ ملے تو چھیننے کے لیے کرپشن کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

اعزازات حاصل کرنا قابلِ فخریات ہے۔ یہ بہترین کارکردگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ انکشاف ہو رہا ہے کہ منفی اعزازات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی مثال فرعون اور ہٹلر ہیں۔ پاکستان نے بھی کرپشن کے حوالے سے بڑا نام کمایا ہے۔

پتا نہیں یہ اعزاز حاصل کر کے کتنے پاکستانی شرمندہ ہیں اور اپنے دامن سے یہ داغ دھونے کے لیے کیا کیا کر رہے ہیں؟ ویسے ناخواندگی یا لاعلمی کے باعث اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دنیا کے ہر درخت کی جڑ اور ہر عمارت کی بنیاد نیچے ہوتی ہے۔ صرف ایک کرپشن ایسا ہے' جس کی بنیاد اوپری منزل پر ہوتی ہے اور نچلی منزل والوں کے ہاتھ اوپری منزل تک پہنچ نہیں پاتے۔ بس ایک دم دلاسا ہوتا ہے کہ محاسبہ کیا جا رہا ہے جبکہ مسلمان کا ایمان یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے محاسبے کے لیے قیامت کا دن مقرر کیا

ہے۔ اگر ایک بندہ دوسرے بندے کا محاسبہ کرے تو ترازو برابر نہیں پکڑ سکے گا کیونکہ اس ترازو کے کسی پلڑے پر اس کا بھی نامۂ اعمال ہو گا۔ اس نامۂ اعمال کو دوسرے نہیں جانتے' صرف اللہ جانتا ہے۔

کوئی تنقید کر کے' تقریر کر کے یا کہانیاں لکھ کر کرپشن کو نہیں مٹا سکتا لیکن یہ شعور دے سکتا ہے کہ کرپشن کیوں بڑھ رہی ہے؟ کہاں سے بڑھ رہی ہے؟ بڑھنے کے طریقے کیا کیا ہیں؟ اور کرپٹ ہاتھوں کی نشان دہی کس طرح کی جا سکتی ہے؟

کرن ماہتاب کے ساتھ جو ہونا تھا' وہ ایک دن ہو کر رہا۔ اسے اغوا کر کے شہر سے دو سو کلومیٹر دور پرانی حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ وہ ایک دن اور ایک رات تک اس حویلی میں قید رہی۔ اسے پتا نہ چلا کہ کس نے اسے اغوا کرایا ہے۔ جمشید کامران ایک اہم معاملے میں مصروف تھا۔ وہ دوسرے دن حویلی میں آیا تو کرن نے چونک کر پوچھا۔ "آپ؟ آپ اس حویلی کے مالک ہیں؟"

"ہاں۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

"اس سے بڑی تکلیف اور کیا ہو گی کہ مجھے یہاں زبردستی لایا گیا ہے۔ اس طرح لائے جانے کے بعد میری عزت خاک میں مل چکی ہے۔ کیا یہاں سے جانے کے بعد میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہوں گی؟"

"میں بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ تم یہاں سے جا کر میرے خلاف بیان دو گی اس لیے واپسی کا خیال دماغ سے نکال دو۔"

"آپ کو شرم آنی چاہیے۔ میں آپ کی بیٹی کے برابر ہوں۔"

"مگر بیٹی نہیں ہو۔"

"میں نے آپ کی بیٹی کو تعلیمی معاملے میں عزت دی ہے۔ اونچا مقام دیا ہے۔"

"ذہین طلبہ و طالبات کی کمی نہیں ہے۔ جس کے آگے نوٹ پھینکوں گا' وہ اپنی ذہانت بیچ کر میری بیٹی کو اونچا مقام دلاتی رہے گی۔"

وہ سوچنے کے انداز میں اس ظالم کو دیکھنے لگی جو پہلے محسن نظر آرہا تھا۔ انسانوں کی دنیا میں ذہانت سے بری کوئی چیز نہیں ہے۔ اسے بازاری انداز میں نہیں بکنا چاہیے۔

تعمیری انداز میں ذہین افراد کی خدمات حاصل کرنا اور بات ہے لیکن جس ذہانت سے نوٹ چھاپے جاتے ہیں' انہی نوٹوں سے تخریبی انداز میں ذہانت کو خریدا جاتا ہے۔

اپنی بیٹی ارم کامران کے لیے جمشید کامران نے دوسری لڑکی کی ذہانت خرید لی۔ یہ معلوم نہیں ہونے دیا کہ کرن ماہتاب اچانک کہاں گم ہو گئی۔ اس کے والدین اور خاندان والے اسے تلاش کرتے رہے۔ بڑے بھائی مراد اکبر اور اس کے ساتھیوں کی نظروں میں جتنے دولت مند عیاش تھے' وہ ان کے گھروں میں اور خفیہ عیش کدوں میں اسے ڈھونڈتے رہے۔ تقریباً ڈھائی برس گزر گئے۔ کرن ماہتاب کا کوئی سراغ نہ ملا۔

بھائی کی غیرت اسے للکارتی رہی اور اس کے اندر غصہ' جنون اور انتقام کا لاوا پکتا رہا۔ لاکھوں بے روزگار نوجوان ہیں' جن کے اندر بے قدری کا آتش فشاں دہکتا رہتا ہے۔ نہ سماج' نہ گھر میں' نہ رشتے داروں میں ان کی قدروقیمت ہوتی ہے اور نہ تعلیمی ڈگریاں ان کی اہمیت بڑھاتی ہیں۔ صاف پتا چلتا ہے کہ انہیں زندگی کے پندرہ بیس برسوں تک کتابوں کے جال میں پھانس کر اس قدر ناکارہ بنا دیا گیا ہے کہ اب وہ پتھر اٹھا کر مزدوری کر کے خود کو گرا نہیں سکتے۔ ہتھیار اٹھا کر طاقت کا مظاہرہ کر کے دہشت گرد بن سکتے ہیں۔ یا لاکھوں روپے کمانے کے لیے غیر ملکی ایجنٹ بن کر کوٹھیوں میں رہ سکتے ہیں اور کاروں میں بیٹھ کر معزز افراد کہلا سکتے ہیں۔ چونکہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں' اس لیے بہ آسانی غیر ملکی ایجنسیوں کے کارندے بن جاتے ہیں۔

مراد اکبر ایسے عیاش رئیسوں کا جانی دشمن تھا جو جوان لڑکیوں کو اغوا کرا کے اپنے عیش کدوں میں چھپا کر یا قیدی بنا کر رکھتے تھے۔ ایسے ہی عیاشوں کو قتل کرنے کے دوران میں مراد اکبر کو پتا چلا کہ جاگیردار جمشید کامران بھی عیاش ہے۔ وہ بظاہر ایک نہایت شریف اور غریب پرور سیاست داں ہے لیکن اندر سے گھناؤنا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ جمشید کامران کی بیگم نے اس کی بہن کی خدمات اپنی بیٹی کی تعلیم کے سلسلے میں حاصل کی تھیں اور وہ ایک دن اس کی کوٹھی کی طرف گئی تھی پھر واپس نہیں آئی۔ جمشید کامران اتنا نیک نام تھا کہ اس پر کسی طرح کا شبہ نہیں ہوا تھا۔ اب مراد کو شبہ ہوا کہ تقریباً ڈھائی برس پہلے گم ہو جانے والی بہن کو جاگیردار جمشید کامران کے حواریوں

نے اغوا کیا ہے۔

وہ ایک رات اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ ڈاکا ڈالنے اس حویلی میں پہنچا۔ وہاں اس نے اپنی بہن کرن ماہتاب کو دیکھا۔ وہ اس عرصے میں ایک بھرپور جوان عورت بن گئی تھی لیکن کچھ نیم پاگل سی تھی۔ پہلے خوش مزاج تھی۔ اب بدمزاج ہو گئی تھی .... مراد اکبر اور اس کے ساتھیوں نے ڈاکوؤں کی طرح منہ پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔ ان سب نے حویلی کے پہرے داروں کو زخمی کیا تھا اور ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ کنیزیں سہمی ہوئی تھیں۔ مراد نے ایک کنیز کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ "کیا یہ حویلی کی مالکن ہے؟"

وہ سہم کر بولی۔ "ہاں مگر آدھی پاگل ہے۔ مالک اسے مالکن بنا کر رکھنا چاہتے ہیں لیکن یہ تین بار یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر چکی ہے۔ پہرے دار اسے پکڑ کر باندھ دیتے ہیں پھر نشے کی گولیاں کھلا کر حویلی کے اندر آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ اسے ایک گھنٹا پہلے ایک گولی کھلائی گئی تھی۔ یہ پوری طرح ہوش میں نہیں ہے اب تو عادی ہو گئی ہے' خود ہی نشہ کرنے لگتی ہے۔"

مراد اکبر نے بڑے دکھ سے بہن کو دیکھا۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنے ملک میں اچھا نام اور مقام حاصل کر سکتی تھی لیکن اس حویلی میں داشتہ بنا دی گئی تھی۔ کیا اب وہ اسے اپنے گھر میں' خاندانی ماحول میں اور محلے میں لے جا سکتا تھا؟ ماں باپ تو اس کی حالت دیکھ کر جیتے جی مر جائیں گے

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "یہاں جتنی نقدی اور زیورات تھے' ہم نے رکھ لیے ہیں۔ یہاں سے نکل چلو۔"

وہ ان کے ساتھ حویلی سے باہر آ کر ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی پھر وہ فائرنگ کرتے ہوئے' وہاں سے فرار ہو گئے۔ ایک ساتھی نے پوچھا۔ "مراد! بہت خاموش ہو؟"

وہ بولا۔ "ہاں۔ اس جاگیردار کی شہر والی کوٹھی میں ایک بہت ہی قیمتی ہیرا ہے۔ میں وہ ہیرا حاصل کروں گا۔ آج کی ڈکیتی کا سارا مال تم لوگ آپس میں بانٹ لو۔ اس وعدے کے ساتھ کہ اس ہیرے کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔"

ایک ہفتے کے بعد جمشید کامران کی بیٹی ارم کامران لاپتا ہو گئی۔ اسے تلاش کرنے اور واپس گھر لانے کے لیے بڑے بڑے ذرائع استعمال کیے گئے لیکن رئیس زادی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ایک رات جمشید اپنی بیگم کے ساتھ بیڈروم میں تھا۔ فون کی گھنٹی سن کر ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے بیٹی کی آواز سن کر چونک گیا۔ تڑپ کر بولا۔ "بیٹی! تم کہاں ہو؟ ہم تمہارے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔ تمہاری ممی کی حالت بری ہے۔ فوراً بتاؤ کہاں ہو؟"

بیٹی نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اس لڑکی کرن ماہتاب کے ساتھ ہوں جس نے مجھے بورڈ کے امتحانات میں فرسٹ پوزیشن دلائی تھی۔"

وہ حیرانی سے بولا۔ "یہ کیا کہہ رہی ہو؟ تم اس کرن کے ساتھ نہیں ہو سکتیں' سچ بتاؤ۔ کیا تم کسی بوائے فرینڈ کے ساتھ ہو؟"

"آپ جانتے ہیں' میرا مزاج ایسا ہے کہ میں نے کبھی کسی کو بوائے فرینڈ نہیں بنایا۔ میں کسی کو لفٹ نہیں دیتی ہوں۔ میں آپ کو بتا رہی ہوں کہ کرن ماہتاب کے ساتھ ہوں تو آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟"

"تم غلط کہہ رہی ہو۔ مجھ سے بحث نہ کرو۔ سچ کیا ہے' بتاؤ۔"

بیگم نے جمشید سے ریسیور لے کر کہا۔ "بیٹی! میں تمہاری ماں بول رہی ہوں۔ مجھے بتادو' تم کہاں ہو؟"

"آپ ڈیڈی سے پوچھیں' جب میں کہہ رہی ہوں کہ کرن ماہتاب کے ساتھ ہوں تو انہیں یقین کیوں نہیں آرہا ہے؟"

بیگم نے اپنے شوہر سے کہا۔ "وہ کہہ رہی ہے کرن ماہتاب کے ساتھ ہے۔ آپ یقین کرلیں تاکہ ہم جاکر اسے لے آئیں۔"

"وہ جھوٹ کہہ رہی ہے۔ کرن کسی عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی پھر نظر نہیں آئی۔ اب وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوگی۔"

ارم نے کہا۔ "میں ڈیڈی کی باتیں سن رہی ہوں۔ ان سے کہیں' میں بھی ایک ہفتے سے بے گھر ہوں۔ میرے بارے میں بھی یہی رائے قائم کی جارہی ہوگی کہ میں کسی کو منہ

دکھانے کے قابل نہیں رہی ہوں۔ بائی دا وے' جب ڈیڈی کو یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ عاشق یہ خود ہیں۔"

ماں نے کہا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ اپنے باپ کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"ممی! آپ کو بھی شرم آئے گی' جب ڈیڈی حقیقت کا اعتراف کریں گے۔ آپ ان سے پوچھیں' کیا کرن ماہتاب ان کی حویلی میں نہیں ہے؟"

بیگم نے کچھ حیرانی سے' کچھ غصے سے اپنے شوہر کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کرن ماہتاب آپ کی حویلی میں ہے؟"

اچانک ایسا سوال کیا گیا تھا کہ وہ بوکھلا گیا پھر فوراً سنبھل کر بولا۔ "یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟ کیا یہ بکواس ارم کر رہی ہے۔ لاؤ فون مجھے دو۔"

اس نے ریسیور لے کر بیٹی سے پوچھا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اپنی ماں سے میرا جھگڑا کرانا چاہتی ہو؟ تم بتاتی کیوں نہیں کہ کہاں ہو؟"

"میں ممی کو بتاؤں گی۔"

"مجھے بتاؤ۔ میں تمہارا باپ ہوں۔"

"ابھی میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ میرے اغوا ہونے کا سبب جو شخص ہے' اسے میں باپ کہہ سکتی ہوں یا نہیں؟ آپ ممی کو فون دیں۔"

وہ ذرا نرمی سے بولا۔ "بیٹی! عقل سے کام لو۔ مجھ سے صاف صاف بات کرو۔"

"صاف اور سیدھی بات یہی ہے کہ آپ نے میری ممی سے بات نہیں کرائی تو میں پریس کانفرنس بلاؤں گی پھر بات بہت بڑھ جائے گی۔"

یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ جمشید کامران نے مجبور ہو کر اپنی بیگم کو دیکھا پھر اسے ریسیور دیتے ہوئے کہا۔ "بیٹی سے بات کرو۔"

وہ ریسیور کان سے لگا کر سننے لگی اور بار بار تیور بدل کر اپنے شوہر کو دیکھنے لگی پھر ریسیور رکھ کر بولی۔ "ہم ابھی پرانی حویلی چلیں گے۔"

"تمہیں بیٹی کی بکواس پر یقین آگیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ ابھی حویلی چلتے ہیں۔ میں

ابھی کمرے سے لباس بدل کر آتا ہوں۔"

"میں حویلی پہنچنے تک آپ کو تنہا نہیں چھوڑوں گی۔ آپ موبائل فون کے ذریعے کمدار کو کوئی اشارہ دیں گے اور کرن ماہتاب کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیا جائے گا۔ اگر آپ نے ایسا تو کیا جانتے ہیں کیا ہو گا؟"

"بیٹی نے پریس کانفرنس کی دھمکی دی ہے۔ تم کس قسم کی دھمکی دینا چاہتی ہو؟ مگر تم میرے اثر رسوخ کو جانتی ہو۔"

"میں بیوی ہوں۔ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے۔ کیا یہ ہمارے لیے ڈوب مرنے کی بات نہیں ہے کہ کرن کے بھائی مراد نے ایک ہفتے سے ہماری بیٹی کو قید کر رکھا ہے لیکن اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ آپ جس کی بہن کی عزت سے کھیلتے رہے' وہ آپ کی بیٹی کی عزت کا محافظ بنا ہوا ہے۔"

"کیا تم نے یقین کر لیا کہ ہماری بیٹی کی عزت محفوظ ہے؟"

"ہاں۔ غریب کے پاس ایک ہی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس عزت کی جو دولت ہوتی ہے' وہ ہمارے پاس نہیں ہوتی۔ بیٹی نے کہا ہے اگر میں ہر دو منٹ کے بعد فون پر رابطہ نہیں کروں گی تو وہ پولیس والوں سے رابطہ کر کے حویلی کا محاصرہ کرائے گی پھر یہ ثابت ہو جائے گا کہ آپ نے کرن ماہتاب کو پچھلے ڈھائی برسوں سے حبسِ بے جا میں رکھا تھا اور اس سے زیادتی کرتے رہے تھے۔"

جمشید کامران نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔ "میں خود پولیس کو کہتا ہوں کہ وہ میری حویلی کا محاصرہ کرے۔"

رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ "ہیلو! میں بول رہا ہوں۔"

اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا پھر کہا۔ "میں تمہیں صرف پانچ منٹ دیتا ہوں۔ پانچ منٹ میں کرن ماہتاب کو حویلی سے کہیں دور لے جا کر ٹھکانے لگا دو۔"

اس نے پھر کچھ سنا۔ اس کے بعد فون بیگم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لو اور ہر دو منٹ بعد ارم سے باتیں کرتی رہو اور اس نادان لڑکی سے کہو' پولیس کے علاوہ فوج کو بھی بلا لے۔"

بیگم تھوڑی دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر حیرانی اور پریشانی سے بولی۔ "آپ نے یہ نہیں سوچا کہ حویلی میں کرن نہیں ملے گی تو اس کا بھائی انسانیت اور شرافت بھول جائے گا اور انتقاماً ہماری بیٹی کی عزت بھی خاک میں ملا دے گا۔"

"یہ تمہارے جیسی احمق عورت سوچ سکتی ہے کہ ہماری بیٹی کی عزت اب تک ایک دہشت گرد کے پاس محفوظ ہو گی۔ اب صرف دعا کرو کہ وہ ہمیں زندہ واپس مل جائے۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ کوئی ہماری بیٹی پر کیچڑ نہیں اچھالے گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بیگم نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو ارم! تم ہو؟"

"یس ممی! آپ نے دو منٹ کے بعد فون کیوں نہیں کیا؟"

"بیٹی! تمہارے باپ نے کسی کو فون کر کے کرن کو حویلی سے ہٹا دیا ہے۔ وہ شاید اسے زندہ نہ چھوڑیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اب میں کیا کروں؟ تمہارے باپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مراد اکبر انتقاماً تمہیں ہلاک کر سکتا ہے۔"

مراد اکبر اسپیکر فون کے ذریعے دونوں.......... ماں بیٹی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بٹن پر ہاتھ رکھ کر فون بند کر دیا۔ ارم نے پوچھا۔ "تم نے فون کیوں بند کر دیا؟"

وہ اس کو گھورتے ہوئے بولا۔ "تمہارا باپ اپنی چال چل گیا ہے۔ اب میری بہن مجھے حویلی میں نہیں ملے گی۔"

وہ نمبر ڈائل کرتے ہوئے بول رہا تھا' رابطہ ہوتے ہی اس نے کہا۔ "ہیلو صمد خان! وہ لوگ کرن کو حویلی سے نکال کر کہیں لے جا رہے ہیں۔ نیشنل ہائی وے اس حویلی سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ وہ اسی راستے پر جا سکتے ہیں۔ تم ساتھیوں کو لے کر اسی طرف جاؤ۔"

اس نے رابطہ ختم کیا پھر اپنی گن اٹھا کر ارم سے بولا۔ "فوراً چلو' دیر نہ کرو۔"

وہ ارم کا بازو پکڑ کر اسے چھوٹے سے مکان سے باہر آیا پھر ایک جیپ میں بیٹھنے لگا۔

وہ بولی۔ "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ یہیں مار ڈالو۔"

"جلدی بیٹھو۔ دیر نہ کرو۔ ہمیں بھی نیشنل ہائی وے تک پہنچنا ہے۔ اللہ کرے' میں کرن کو بچا لوں۔"

وہ تیز رفتاری سے جیپ چلا رہا تھا۔ ارم نے کہا۔ "میں دعا کر رہی ہوں کہ وہ زندہ رہے لیکن میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ تم مجھے مار ڈالو۔"

"مارنے کی فرمائش نہ کرو۔ یہ سوچو' کیا ہم زندہ ہیں؟ کیا زندگی ایسی ہوتی ہے جیسی ہم گزار رہے ہیں؟ تمہیں قتل کر ڈالنا کون سی بڑی بات ہے۔ ہلاکت اور بربادی تو ہو ہی رہی ہے۔ یہ رائفل ہمارے درمیان رکھی ہوئی ہے۔ اسے اٹھا کر تم مجھے مار ڈالو یا میں تمہیں مار ڈالوں تو یہ ایک معمول ہو گا کہ ایسا تو ہو ہی رہا ہے لیکن ہم ایک دوسرے کو زندہ رکھیں۔ تم اپنے طبقے میں خوش رہو۔ میں اپنے طبقے میں خوش رہوں تو کیا ہماری یہ دنیا تھوڑی سی خوب صورت نہیں ہو جائے گی؟"

"تم نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ ہم اپنی دنیا کو بہت زیادہ نہ سہی' اپنے عمل سے تھوڑا سا خوب صورت بنا سکتے ہیں۔ ویسے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جب تم ایک ہفتے پہلے اپنی بہن کو حویلی میں دیکھ چکے تھے تو اسی وقت اسے وہاں سے کیوں نہیں لے گئے؟"

"میں نے اسے دیکھ کر سوچا' کہاں لے جاؤں؟ جہاں بھی لے جاؤں گا' اسے بدنامی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا میں تمہیں اغوا کروں اور تمہاری رہائی کی شرط یہ رکھوں کہ تمہارا باپ میری بہن سے باقاعدہ نکاح پڑھوائے اور اسے ہماری سوسائٹی میں ایک منکوحہ کی عزت دے تو پھر وہ بدنام نہیں ہو گی۔"

"تم نے عزت بنائے رکھنے کی بہت اچھی تدبیر سوچی اور اس پر عمل بھی کیا ہے۔ میری دعا ہے' تمہاری بہن زندہ سلامت رہے۔ میں تمہارے اس مشن کو پورا کروں گی۔ اپنے ڈیڈی پر مختلف ذرائع سے دباؤ ڈال کر انہیں کرن ماہتاب سے نکاح پڑھوانے پر مجبور کروں گی۔"

☆==========☆==========☆

وہ نیشنل ہائی وے پر پہنچ گئے تھے۔ ان سے آگے تقریباً تیس کلومیٹر کی دوری پر کمدار ایک کار میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر کرن ماہتاب ایک کنیز کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر ہلکا سا نشہ طاری تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "میں جانتی ہوں کمدار! تُو اپنے مالک کا تابعدار ہے۔ مجھے کسی اچھی نیت سے نہیں لے جا رہا ہے۔"

کمدار نے کہا۔ "ہاں میری نیت اچھی نہیں ہے۔ ابھی راستے میں کتے ملیں گے تو میں تجھے ان کتوں کے آگے ڈال کر چلا جاؤں گا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی کئی گھڑ سوار سڑک کے دونوں طرف سے نکل کر کار کا تعاقب کرتے اور فائرنگ کرتے ہوئے انہیں رکنے پر مجبور کرتے رہے۔ کرن کے دماغ میں یہ بات آئی کہ یہ وہی کتے ہیں' جن کا ذکر ابھی کمدار کر رہا تھا۔ فائرنگ کے باعث کار کو روکنا پڑا۔ اس کے رکتے ہی کرن اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور ایک سمت بھاگنے لگی۔ کمدار نے اور کنیز نے چیخ کر کہا۔ "کرن! رک جاؤ۔ رک جاؤ کرن!"

کرن کا نام سنتے ہی ایک گھڑ سوار نے کئی فائر کیے۔ کئی گولیاں کرن کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ وہ زمین پر گر گئی پھر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔

وہ ادھر مصروف رہے۔ ادھر کمدار کی کار پوری تیز رفتاری سے چلی گئی۔ ان گھڑ سواروں نے ان کار والوں سے کچھ نہیں لینا تھا۔ تمام گھڑ سوار بدیع الزماں کے تابعدار تھے۔ وہ کرن ماہتاب کو نہیں' کرن خورشید کو قتل کرنے آئے تھے اور اپنا کام کر چکے تھے۔ انہوں نے فون پر بدیع الزماں کو خوش خبری سنائی کہ انہوں نے کرن کو ہلاک کر دیا ہے۔ اور اس کی لاش کی تصویریں لا رہے ہیں۔

وہ سب آدھے گھنٹے کے اندر چلے گئے۔ لاش اسی ویران جگہ سڑک کے کنارے

پڑی رہی۔ کوئی اسے پوچھنے اور پہچاننے والا نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد مراد اکبر نے وہاں سے گزرتے ہوئے کسی عورت کی لاش دیکھی پھر قریب جا کر جیپ کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا تو بہن نظر آئی۔ وہ سکتے کی حالت میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ارم جیپ سے اتر کر لاش کے پاس آئی۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اس کے سامنے اس طالبہ کی لاش پڑی تھی' جس نے اپنی ذہانت سے اسے اے ون گریڈ کی پوزیشن دلائی تھی۔ اس کے عوض اس کیا ملا؟ یہی کہ اسے ذلت کے گڑھے میں گرا دیا گیا۔

ارم دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مراد ہاتھوں میں رائفل لیے سر جھکائے کھڑا تھا۔ ارم نے پلٹ کر اسے دیکھا اس کے پاس آ کر اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔ "تم بزدل ہو۔ بے غیرت ہو۔ ایک قاتل کی بیٹی تمہارے سامنے کھڑی ہے' گولی کیوں نہیں چلاتے؟ مجھے قتل کیوں نہیں کرتے؟ تمہیں بہن کی لاش دی گئی ہے۔ تم یہاں سے بیٹی کی لاش بھیج دو۔ تم خاموش کیوں ہو؟ بولو یہاں ایک مجبور کی طرح سر جھکائے ہوئے کیوں ہو؟"

وہ بولا۔ "تمہارے رونے اور چیخنے سے میری بہن زندہ نہیں ہو جائے گی اور میں تمہیں قتل کروں گا تو تم سے پہلے تہذیب مر جائے گی۔ میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

پھر وہ سر جھکا کر بولا۔ "مردانگی یہ ہے کہ بازوؤں میں قوت ہو۔ ہاتھوں میں ہتھیار ہو اور وہ قتل نہ کرے۔ حفاظت کرے۔"

دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ وہ قریب آ کر رک گئیں۔ ان میں مراد اکبر کے ساتھی تھے۔ وہ گاڑیوں سے اتر کر آئے۔ کرن ماہتاب کی لاش دیکھ کر اپنے سر جھکا لیے۔ ایک نے مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یار! ہم نے پہنچنے میں دیر کر دی۔"

مراد نے کہا۔ "میں نے بھی دیر کر دی۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ یہ میری بہن کے لیے بہتر ہوا۔ یہ بدنامی اٹھانے سے پہلے دنیا سے اٹھ گئی۔"

دوسرے ساتھی نے ارم کو دیکھ کر پوچھا۔ "یہ وہی ہے' جسے تم نے اغوا کیا تھا؟"

تیسرے نے کہا۔ "ہاں۔ یہ جاگیردار جمشید کامران کی بیٹی ہے۔"

"مراد! پھر تو دشمن کی بہت بڑی کمزوری ہمارے ہاتھوں میں ہے۔"

مراد نے کہا۔ "بہنیں اپنے بھائیوں کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہیں۔ یہ ہماری بہن ہے۔ بعد میں دشمن کی بیٹی ہے۔"

"کیا تم اس جاگیردار کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرو گے؟"

مراد نے کہا۔ "ارم اپنے باپ کے خلاف کارروائی کرے گی۔ یہ لاش اپنے گھر لے جائے گی اور جو مناسب سمجھے گی' وہ کرے گی۔"

اس کے ساتھیوں نے کرن کی لاش اٹھا کر ایک گاڑی میں رکھ دی پھر وہ قافلہ وہاں سے چل پڑا۔

☆=========☆=========☆

عورت خواہ کتنی ہی سنگ دل ہو' اپنے بچے کو سینے سے لگا کر دودھ پلاتے وقت موم ہو جاتی ہے۔ اس وقت گن مین کی موٹی بیوی بھی سڑک کے کنارے بیٹھ کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔

وہ بہت سنگدل تھی۔ اب موم ہو کر سوچ رہی تھی۔ "یہ لڑکی میرا بچہ واپس نہ دیتی تو یہ بھوک سے بلک بلک کر مر جاتا۔ اس نے میرے بچے پر ترس کھایا ہے لیکن مجھے یہ سوچ کر ترس نہیں آیا تھا کہ ہمارا صاحب کسی بھی وقت آ کر اس کی عزت سے کھیلنا شروع کر دے گا۔"

کرن نے بچے کو ماں کے حوالے کیا تھا لیکن پستول کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑے بچے کو نشانے پر رکھے ہوئے تھی۔ وہ رحم کھا رہی تھی لیکن دھمکی بھی دے چکی تھی کہ وہ موٹی اور گن مین اسے نقصان پہنچانے کی چالاکی دکھائیں گے یا بھاگنے کی کوشش کریں گے تو وہ فوراً بچے کو گولی مار دے گی۔

وہ گن مین اپنی بیوی اور بچے کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ اب وہ صرف نام کا گن مین رہ گیا تھا۔ اپنی......... رائفل جلتے ہوئے مکان میں چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت نہتا تھا۔ ایک شہ زور مرد ہونے کے باوجود کرن جیسی کمزور لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ جس کے ہاتھ میں ہتھیار ہوتا ہے' وہی شہ زور ہوتا ہے۔ اس کے سامنے مردانگی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

وہ بولا۔ "اسی کچی سڑک پر پتا نہیں کتنی دور جانے سے کوئی پکی سڑک ملے گی۔ اتنی دیر میں ہمارے صاحب کے مسلح تابعدار پہنچ کر تمہیں گھیر لیں گے۔ تم ایک پستول سے کتنوں کو گولی مارو گی؟ وہ سب تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔"

وہ بولی۔ "انہیں گولیاں چلانے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ میں صرف دو گولیاں چلاؤں گی۔ ایک گولی سے بچہ مرے گا اور دوسری سے میں مرجاؤں گی۔ اگر تمہارے پاس عقل ہے تو میری نہیں' اپنے بچے کی سلامتی کے لیے سوچتے رہو کہ ہم کس طرح دشمنوں سے چھپتے ہوئے شہر تک پہنچ سکتے ہیں۔"

موٹی نے اپنے میاں سے کہا۔ "یہ عقل کی بات کہہ رہی ہے تجھے کس طرح بھی بچے کی جان بچانا ہے۔ اگر صاحب کے تابعدار آئیں تو تجھے کسی طرح بچے کے ساتھ اور ہمارے ساتھ چھپنا ہے اور ان سے جان چھڑانا ہے' یہ تجھ کو اچھی طرح سوچنا اور سمجھنا ہو گا۔"

وہ بولا۔ "کیا بچے کی فکر صرف تجھے ہے' مجھے نہیں ہے؟ یہ میرا بھی بچہ ہے لیکن اتنی دیر تک دودھ پلائے گی تو ہم سب یہیں مارے جائیں گے۔"

کرن نے کہا۔ "بس کرو۔ دودھ اسے پلا چکی ہو۔ اب اسے زمین پر رکھ کر پیچھے چلی جاؤ۔ میں پہلے کی طرح اسے اٹھا کر لے جاؤں گی۔"

"میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بچے کو میری گود میں رہنے دے۔"

"نہیں' بچہ میرے پاس رہے گا تو فکر سے تیری جان نکلتی رہے گی اور تو میرے ایک ایک اشارے پر چلتی رہے گی۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ کرن نے سخت لہجے میں کہا۔ "دیر کرے گی تو مجھے اس بچے پر ترس نہیں آئے گا۔ میں تم تینوں کو ہلاک کر کے یہاں سے تنہا بھی جا سکتی ہوں۔"

ماں نے مجبور ہو کر بچے کو سینے سے الگ کیا۔ وہ دودھ پی کر سو گیا۔ اس نے زمین پر ڈال دیا پھر اپنے میاں کے ساتھ کئی قدم پیچھے چلی گئی۔ کرن نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا اور دوسرے ہاتھ سے پستول کے ذریعے نشانہ لے کر بولی۔ "اب جتنی تیزی سے چل سکتے ہو چلو۔ مجھے یقین ہے' ہم کسی بڑی سڑک تک پہنچ جائیں گے۔"

وہ سب تیزی سے آگے پیچھے چلنے لگے۔ خوف کے باعث چلتے رہنے سے پتا نہیں چلا کہ کتنا فاصلہ طے ہو گیا اور کتنا وقت گزر گیا۔ آخر وہ نیشنل ہائی وے تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک سنگِ میل پر لکھا ہوا تھا' کراچی بائیس کلومیٹر کے فاصلے پر رہ گیا ہے۔

کرن ان دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔ "جب تک کوئی بس یہاں سے نہ گزرے یا کسی گاڑی سے لفٹ نہ ملے' ہم چلتے رہیں گے۔ صبح ہونے والی ہے۔ کوئی گاڑی ضرور مل جائے گی۔"

تھوڑی دیر بعد اس نے سر گھما کر دیکھا۔ پیچھے بہت دور گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں۔ کرن نے کہا۔ "سڑک کے کنارے درختوں کے پیچھے چلو اور موٹی! تم یہاں کھڑی ہو کر لفٹ مانگو گی۔ وہ گاڑیاں رکیں گی تو پتا چلے گا کہ ان میں میری جان کے دشمن ہیں یا عام مسافر؟"

وہ بچے کو سینے سے لگا کر ایک درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ میاں بیوی سڑک کے کنارے کھڑے رہے۔ قریب آنے پر پتا چلا' وہ تین گاڑیاں تھیں۔ ان میاں بیوی نے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب آ کر رک گئیں۔ گن مین نے کہا۔ "میرا نام قمرالدین ہے اور یہ میری گھروالی ہے۔ کیا آپ لوگ ہمارے صاحب بدیع الزماں کے آدمی ہیں؟"

مراد اکبر نے کہا۔ "ہم کسی بدیع الزماں کو نہیں جانتے۔ کیا تم دونوں شہر جانا چاہتے ہو؟"

"ہاں جانا تو چاہتے ہیں مگر یقین کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے صاحب کے آدمی نہیں ہیں۔"

مراد اکبر کے ساتھ بیٹھی ہوئی ارم کامران نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اپنے صاحب کے آدمیوں سے خطرہ ہے؟ تم لوگ کون ہو؟"

کرن نے درخت کے پیچھے سے نکل کر کہا۔ "میں بتاتی ہوں۔ ان میاں بیوی نے اپنے صاحب کے حکم پر مجھے ایک مکان میں قید کیا تھا۔ میں ان کے بچے کو یرغمال بنا کر شہر پہنچ کر قانون کی پناہ میں پہنچنا چاہتی ہوں۔"

وہ سب کرن کو' اس بچے کو اور پستول کو دیکھ رہے تھے۔ مراد نے کہا۔ "تمہارے

اس انداز.......... سے پتا چلتا ہے کہ تمہیں جبراً قید کیا گیا ہے اور تم نے بڑی چالاکی سے ان کے بچے کو یرغمال بنا لیا ہے۔ تم بہت حوصلے والی لڑکی ہو.......... ہم تمہیں شہر لے چلیں گے اور تمہیں انصاف دلائیں گے۔"

کرن نے کہا۔ "بے شک مجھے مدد کی ضرورت ہے مگر آپ کے تمام لوگ مسلح ہیں۔ میں نہیں جانتی' آپ لوگ کون ہیں؟ میں دھوکے سے ماری جا سکتی ہوں۔ اگر آپ مجھ سے ہمدردی کرنا چاہتے ہیں تو میری شرائط پر عمل کریں۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ کا کوئی گن مین میرے قریب نہ آئے۔ آپ کی گاڑی کی پچھلی سیٹ خالی ہے۔ میں اس بچے کے ساتھ وہاں بیٹھوں گی۔"

"پچھلی سیٹ پر میری بہن کرن کی لاش ہے۔"

"کرن!" وہ حیرانی سے بولی۔ "آپ کی بہن کا نام کرن تھا؟"

"ہاں۔ کیا تم میری بہن کو جانتی ہو؟"

"جانتی تو نہیں ہوں۔ دراصل میرا نام بھی کرن ہے' کرن خورشید۔"

مراد اکبر نے ایک نئے اور گہرے جذبے سے کرن کو دیکھا۔ تصور میں اسے اپنی بہن کرن ماہتاب بچے کو پستول کے نشانے پر رکھے نظر آئی لیکن کرن ماہتاب عام لڑکیوں کی طرح کمزور تھی۔ حوصلہ نہ کر سکی تھی اس لیے مظالم برداشت کرتے ہوئے مر گئی تھی اور وہ کرن جو سامنے کھڑی ہوئی تھی' وہ حوصلہ مند تھی۔

وہ بولا۔ "تم میری کرن ہو۔ میری بہن ہو۔ یہ ایک مرد کی زبان ہے۔ پچھلی سیٹ پر لاش کے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔ میرے پیچھے رہو تاکہ کوئی تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو تم مجھے آسانی سے گولی مار سکو۔"

وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ پوری سیٹ پر لاش رکھی ہوئی تھی۔ کرن اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان نیچے بیٹھ گئی۔ وہ میاں بیوی دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔

جب وہ گاڑیاں بڑھنے لگیں تو دور کسی مسجد میں فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔

مراد نے کہا۔ "تم مجھے بڑا بھائی سمجھ کر اپنی روداد سناؤ گی؟"

وہ روداد سنانے لگی۔ مراد نے سب کچھ سننے کے بعد کہا۔

"تمہارا نام اور میری بہن کا نام ایک ہے اور روداد بھی تقریباً ایک جیسی ہے۔ میرا مشورہ ہے' تم آئی جی پولیس کے سامنے پیش ہو جاؤ۔ ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔"

"معقول مشورہ ہے۔ میں یہی کروں گی۔"

آفتاب طلوع ہو رہا تھا اور ان کے آس پاس کی دنیا روشن ہو رہی تھی۔

☆=========☆=========☆

بیگم اور بدیع الزماں تین بجے رات سے جاگ رہے تھے۔ فارم ہاؤس کے مکان میں آگ لگنے کی اور کرن کے فرار ہونے کی خبر نے ان کی نیندیں اڑا دی تھیں۔ ان کا بیٹا رئیس الزماں ڈرائنگ روم میں تھا اور اپنے تابعداروں سے رابطہ کر رہا تھا پھر یہ خوش خبری ملی کہ ان کے آدمیوں نے کرن کو گولی مار دی ہے۔

اس خبر نے ان کے سروں سے پہاڑ ہٹا دیئے تھے۔ اب وہ کرن کی لاش کی تصویریں دیکھ کر پوری طرح مطمئن ہونا چاہتے تھے۔ ان کے آدمی جلد ہی وہ تصویریں وہاں لا کر انہیں دکھانے والے تھے۔ بیگم نے کہا۔ "آپ تھوڑی دیر کے لیے سو جائیں۔ تصویریں آئیں گی تو میں اور رئیس دیکھ لیں گے۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے۔"

وہ تھکے ہوئے انداز میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں پھر چند منٹ کے بعد ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیگم نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"بیگم! ایک بات کھٹک رہی ہے۔ وہ گن مین اور اس کی بیوی کہاں ہیں؟ جہاں ہمارے آدمیوں نے کرن کو ہلاک کیا ہے' وہاں ان دونوں کو بھی اپنے بچے کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔"

"یہ ممکن ہے' جب انہوں نے دیکھا کہ کرن فرار ہو گئی ہے اور میں ان کی بے پروائی کی سزا دوں گا تو وہ مجھ سے خوف زدہ ہو کر کہیں بھاگ گئے ہوں گے۔" رئیس الزماں نے کہا۔

"وہ میاں بیوی جہنم میں جائیں۔ ہم بہت بڑی مصیبت سے نکل گئے ہیں۔ اب

ہمیں اپنے بیٹے پر ذرا سختی کرنی ہوگی۔ ہم نے اسے اتنی ڈھیل دی ہے کہ............"

"ہم نہ کہو۔ تم کہو۔ تم نے اسے زیادہ سر پر چڑھایا ہے۔"

"اور آپ تو جیسے ہٹلر باپ بنے رہے۔ سارا الزام مجھے نہ دیں۔ آپ اس کی تمام فرمائشیں پوری کرتے رہے ہیں۔ اگر ہم دونوں تعلیم کے معاملے میں بچپن سے اس پر سختی کرتے رہتے تو آج اتنے مسائل پیدا نہ ہوتے۔"

"جب پودا ننھا سا ہوتا ہے تو اس کی نرم شاخوں کو کسی طرف بھی جھکایا جا سکتا ہے۔ وہی پودا بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن جائے تو اس کی شاخوں کو جھکانا ممکن نہیں ہوتا۔ زبردستی جھکایا جائے تو شاخیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اب ہم جوان بیٹے پر جبر نہیں کر سکتے۔ اسے اپنی مرضی کے راستے پر چلا نہیں سکتے پھر یہ کہ وہ صرف تعلیم کے معاملے میں بے پروا ہے ورنہ دولت کمانے اور اپنی برتری قائم رکھنے کے معاملے میں بالکل ہم پر گیا ہے۔ کبھی ناک نیچی نہیں ہونے دیتا۔"

اسی وقت نیچے ڈرائنگ روم سے رئیس الزماں کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے سے گرج رہا تھا۔ وہ دونوں بیڈ روم سے نکل کر باہر گئے۔ باپ نے پوچھا۔ "بیٹا! کیا بات ہے؟"

بیٹے کے سامنے دو تابعدار ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے چند فوٹو اٹھا کر ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ نمک حرام پتا نہیں کس کی لاش کی تصویریں اتار کر لے آئے ہیں اور کہتے ہیں' یہ کرن ہے۔"

بدیع الزماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا انہوں نے کرن کو ختم نہیں کیا؟ کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

بیٹے نے کہا۔ "جب یہ کتے کسی دوسری لڑکی کو کرن سمجھ کر اسے قتل کر کے تصویریں لائے ہیں تو پھر یقیناً وہ زندہ ہے۔"

ایک تابعدار نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مالک! ہم قسم کھا کر کہتے ہیں۔ جس کار میں یہ جا رہی تھی' اس کار والے نے اور اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی عورت نے اسے بار بار کرن کہہ کر پکارا تھا اور وہ ہمیں دیکھتے ہی کار سے اتر کر بھاگ نکلی تھی۔"

دوسرے تابعدار نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم برسوں سے آپ کا نمک کھا رہے

ہیں۔ کبھی جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ کسی دوسری لڑکی کو قتل کر کے آپ کو دھوکا دینے کی نادانی نہیں کر سکتے۔ ہم اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتے ہیں.........."

بدیع الزماں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کرو۔ زیادہ نہ بولو۔ فوراً جا کر اسے تلاش کرو۔ فون کر کے.......... دوسروں کو خبر کرو کہ ہمیں دھوکا ہوا ہے۔ کرن ماری نہیں گئی ہے۔ زندہ ہے۔ اسے تلاش کرتے رہو اور اسے شہر پہنچنے نہ دو۔"

وہ دونوں اسی طرح ہاتھ جوڑے سر جھکائے وہاں سے چلے گئے۔ بدیع الزماں اپنی بیگم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے بولا۔ "چند گھنٹوں کے لیے اطمینان ہوا تھا کہ کمبخت ماری گئی ہے ہم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی لیکن پھر وہی دھڑکا لگ رہا ہے۔ آخر وہ کہاں جا کر چھپ گئی ہے۔ ہمارے سب ہی بندے اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہے ہیں۔"

بیگم نے کہا۔ "آپ تھوڑی دیر کے لیے سب باتیں بھول جائیں۔ آپ ابھی سے اپنے ذرائع استعمال کریں۔ میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

بیٹے نے کہا۔ "ممی! مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ میں نے کرن کے اور فہیم کے گھر کے آس پاس اپنے آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ انہیں حکم دیا ہے کہ جیسے ہی محلے میں یا اپنے مکان کے قریب وہ نظر آئے' اسے گولی مار دی جائے۔"

"گولی تو ماری گئی تھی مگر وہ کوئی اور نکلی۔ یہاں مقدر کو ماننا پڑتا ہے۔ کرن کے نصیب اچھے ہیں' وہ کسی نہ کسی طرح بچ رہی ہے۔ اب مجھے یہی فکر ہے کہ وہ بچ نکلی تو کیا ہو گا؟"

وہ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اب یہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنے بڑے اور اہم ذرائع استعمال کرے اور آنے والے خطرے سے پہلے اپنی حفاظت کا انتظام کر لے۔ اس نے غسل سے فارغ ہو کر اچھا سا لباس پہنا تاکہ بااقتدار اہم شخصیات سے ملاقات کرے۔

دن کے دس بجے وہ کوٹھی سے نکلنے ہی والا تھا کہ اسی وقت پولیس کی گاڑیاں احاطے میں داخل ہوئیں۔ ایک گاڑی میں سے اے ایس پی نے باہر آ کر بدیع الزماں سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ ایک معروف ہستی ہیں۔ میں آپ کو جانتا ہوں۔ کیا یہ آپ

کا بیٹا رئیس الزماں ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا رئیس الزماں ہے۔"

اے ایس پی نے انسپکٹر سے کہا۔ "اس حراست میں لے لو۔"

بدیع الزماں نے چونک کر پوچھا۔ "آپ میرے بیٹے کو کس جرم میں گرفتار کر رہے ہیں؟"

"آپ پولیس اسٹیشن آکر تفصیلات معلوم کر سکتے ہیں۔"

"کچھ تو معلوم ہو۔ آپ چند الفاظ میں بتا دیں۔"

"اس نے جس طالبہ کرن خورشید کو اغوا کیا تھا' وہ بازیاب ہو چکی ہے۔"

انسپکٹر رئیس الزماں کو ہتھکڑی پہنا کر ایک گاڑی میں بٹھا چکا تھا۔ بدیع الزماں نے کہا۔ "آپ قانونی کارروائی ضرور کریں۔ مگر پلیز چند منٹ کے لیے میرے ساتھ اندر چل کر بات کر لیں۔ میرے بیٹے پر الزام غلط ثابت کیا جا سکتا ہے؟"

"میں سمجھ رہا ہوں' آپ سیاہ کو سفید کرنے کے لیے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جانا چاہتے ہیں لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے آئی جی صاحب اس کیس میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ آپ کسی بھی پولیس افسر کو ڈھال نہیں بنا سکیں گے۔"

اے ایس پی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا پھر پولیس کی گاڑیاں وہاں سے روانہ ہو گئیں۔ بدیع الزماں غصے سے دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی توہین تھی کہ اس کے بیٹے کو ہتھکڑی پہنائی گئی تھی۔ سوسائٹی میں یہ بات چھپنے والی نہیں تھی۔ اس کی عزت خاک میں ملنے والی تھی۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیو کرتا ہوا کہیں چلا گیا۔ ظاہر ہے بیٹے کی حفاظت کے لیے کوئی بڑا قدم اٹھانا تھا۔

☆=========☆=========☆

انٹیلی جنس کا افسر بلال احمد اپنے طریقہ کار کے مطابق تحقیقات کر رہا تھا۔ یہ بات چھپی ہوئی نہیں تھی کہ امیر کبیر آدمی اپنے بچوں کے لیے غریب اور بے روزگار طلبہ اور طالبات کی ذہانت خریدتے ہیں۔

اس نے بورڈ آف ایجوکیشن میں جا کر تحقیقات شروع کی۔ محکمہ تعلیم کے اعلیٰ

عہدیداروں سے ملاقات کرتا رہا پھر ایک متعلقہ عہدیدار سے کہا۔ "میں آپ سے ایک تعاون کی درخواست کرتا ہوں۔ دو برس پہلے بورڈ کے جو امتحانات ہوئے تھے' میں وہ امتحانات دینے والے طلبہ کے پرچے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس عہدیدار نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شہر میں طلبہ ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ کیا آپ کئی ہزار پرچے چیک کر سکیں گے؟"

"میں سب پرچوں کو دیکھنے کی بات نہیں کر رہا ہوں' ان میں سے مجھے ایک طالب علم کے نام سے پرچے نکالنے ہیں اس کا نام رئیس الزماں ہے۔ میں صرف اسی کے پرچوں کو چیک کروں گا۔"

"اچھا سمجھ گیا لیکن ہزاروں حل کیے ہوئے پرچوں کا بنڈل باندھ کر انہیں اسٹور میں رکھ دیا جاتا ہے۔ آپ گودام نما سٹور میں جا کر دو برس پہلے کے پرچے کتنے ماہ اور کتنے برسوں میں تلاش کریں گے؟"

"میں تنہا ایسا نہیں کروں گا۔ میرے ساتھ میرا ماتحت اسٹاف بھی ہو گا۔"

"تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں یہاں آکر اپنا کام کر سکتے ہیں۔"

بلال احمد اس کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے چلا آیا۔ اپنے ماتحت کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنے چند ماتحت افراد کے ساتھ دوپہر کو ایک گودام میں جائے اور وہاں سے رئیس الزماں کے رول نمبر کے مطابق پرچے تلاش کرے۔ فون کی گھنٹی بجنے پر اس نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو' کون؟"

دوسری طرف سے خان اعظم خان کی آواز آئی۔ "ہیلو بلال! اغوا شدہ کرن واپس آگئی ہے۔ اس نے آئی جی پولیس کے سامنے بیان دیا ہے کہ اسے بدیع الزماں کے بیٹے نے اغوا کرایا تھا۔ میں پولیس اسٹیشن میں ہوں تم بھی چلے آؤ۔ کرن خورشید ڈرامائی انداز میں واپس آئی ہے۔ ایک پولیس پارٹی اس بڑے باپ کے بیٹے رئیس الزماں کو گرفتار کرنے گئی ہے۔"

بلال احمد ایک گھنٹے بعد پولیس اسٹیشن پہنچا تو وہاں رئیس الزماں کو ہتھکڑی پہنا کر لایا

جا چکا تھا۔ اے ایس پی نے تھانیدار سے کہا۔ "اس سے اقبالی بیان لکھواؤ کہ اس نے کرن خورشید کو اغوا کرایا تھا۔"

رئیس الزماں نے کہا۔ "نہ میں نے اغوا کرایا ہے اور نہ ہی ایسا بیان لکھوں گا۔"

"کیا تم نے اپنے فارم ہاؤس کے ایک مکان میں اسے قید نہیں کرایا تھا؟ یہ دونوں میاں بیوی اپنے بچے کے ساتھ وہاں تھے اور اس کی نگرانی کرتے تھے۔"

"شاید آپ نہیں جانتے کہ ہمارے فارم ہاؤس کا وہ مکان جل کر راکھ ہو گیا ہے۔"

"ہم سب جانتے ہیں۔ کرن نے وہاں سے فرار ہونے کے لیے ان میاں بیوی اور ان کے بچے کو یرغمال بنایا تھا اور وہاں آگ لگائی تھی۔ اس طرح سے اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔"

اس بچے کو ماں باپ کے ساتھ وہاں لایا گیا۔ رئیس الزماں انہیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ "کیا اب بھی انکار کرو گے کہ یہ میاں بیوی تمہارے فارم ہاؤس کے ملازم نہیں ہیں؟"

وہ پہلے گھبرایا پھر بولا۔ "ملازم ہیں مگر میں نے کسی کو حکم نہیں دیا تھا کہ کرن کو اغوا کیا جائے اور نہ ہی ان میاں بیوی سے کہا تھا کہ اسے میرے مکان میں قید کریں۔"

اس کے ملازم نے کہا۔ "مالک! وہ آپ کا فارم ہے۔ آپ کا مکان ہے۔ ہم آپ کے حکم کے بغیر وہاں ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں رکھ سکتے۔ ہم نے تو آپ کے حکم سے اسے وہاں چھپایا تھا مگر یہ بہت چالاک نکلی۔ مکان میں آگ لگا کر ہمارے بچے کے ساتھ جل مرنا چاہتی تھی۔ میں نے مجبور ہو کر اپنا ہتھیار اسے دے دیا اور یہ بچے کو لے کر یہاں تک ہمیں لے آئی ہے۔"

اے ایس پی نے رئیس الزماں سے پوچھا۔ "اب کیا کہتے ہو؟"

رئیس الزماں نے کہا۔ "میں اغوا کی واردات سے انکار کرتا ہوں۔ آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ میں نے اسے اغوا کرایا تھا۔ یہ دونوں میرے ملازم ضرور ہیں لیکن انہوں نے بڑی رقم کے لالچ میں اغوا کی گئی اس لڑکی کو میرے مکان میں چھپا دیا ہو گا۔ اب اپنے بچے کی جان بچانے کے لیے میرا نام اس لیے لے رہے ہیں کہ وہ فارم

ہاؤس میرا ہے۔"

اے ایس پی نے کہا۔ "تم چھٹے ہوئے باپ کے چھٹے ہوئے بیٹے ہو۔ آسانی سے جرم قبول نہیں کرو گے۔ اسے ابھی لاک اپ میں رکھو۔ ہمیں سچ اگلوانا آتا ہے۔"

سپاہی اسے حوالات میں لے گئے۔ اسی وقت جمشید کامران تھانے پہنچ گیا۔ اس کی بیٹی ارم کامران بھی وہاں مراد اکبر کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ انسپکٹر نے کہا۔ "جناب جمشید کامران! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تعلیم کے نام پر جرائم ہو رہے ہیں۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے لیکن آپ کی صاحب زادی نے تحریری بیان دیا ہے کہ آپ نے بیٹی کے لیے بڑی بڑی تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے لیے کرن ماہتاب کی ذہانت خریدی تھی۔ بعد میں اس کرن کو اغوا کرایا اور جب راز کھلنے کی بات آئی تو اسے قتل کرا دیا۔ اس بیچاری کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گئی ہوئی ہے۔"

جمشید کامران نے کہا۔ "یہ میرے وکیل ہیں۔ میری ضمانت کے کاغذات لائے ہیں۔ پہلے تو آپ اسے پڑھ لیں۔"

وکیل نے کاغذات انسپکٹر کے سامنے رکھے۔ جمشید کامران نے کہا۔ "میری بیٹی ایک ہفتہ پہلے اپنے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ مجھے فون پر دھمکیاں دیتی تھی کہ اگر میں نے اس کے عاشق کو اپنا داماد تسلیم نہ کیا تو یہ میری مخالفت میں کچھ بھی کر سکتی ہے اور واقعی وہ جو کچھ کر رہی ہے اور یہاں آکر تحریری بیان دینے کے بعد پریس والوں کو بھی شاید یہ بیان دے گی تو میں اسے من مانی کرنے سے کیسے روک سکتا ہوں۔"

ارم نے کہا۔ "ڈیڈی! مجھے یہ سن کر شرم آ رہی ہے کہ آپ اپنی بیٹی کا کوئی فرضی عاشق پیدا کر کے اپنی بیٹی کے کردار پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ میں جانتی ہوں' آپ صرف اپنی جھوٹی شان اور برتری قائم رکھنے کے لیے ایسی شرمناک باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو یقین ہے کہ اس طرح آپ کرن ماہتاب کے اغوا اور قتل کے الزام سے بری ہو جائیں گے۔ بعد میں ممی کے ذریعے مجھے بہلا پھسلا کر گھر لے آئیں گے۔ امیر باپ کی بیٹی کے دامن پر باپ کا لگایا ہوا داغ لگے گا تو وہ دولت کی چمک دمک میں کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ آپ کے پاس اتنی دولت ہے کہ کوئی بھی میرا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے گا اسی لیے

آپ اپنے تحفظ کے لیے مجھے آبروباختہ بنا رہے ہیں۔ مجھے آپ کو باپ کہتے ہوئے شرم آرہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے آنچل میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ جمشید کامران نے کہا۔ "میری بیٹی میں یہ بڑی خاصیت ہے کہ جب چاہتی ہے' ایسی ڈرامائی اور جذباتی سچویشن پیدا کر لیتی ہے۔ بہرحال میں عدالت سے حاصل کیا ہوا ضمانت نامہ پیش کر چکا ہوں۔ مجھے جانے کی اجازت ہے؟"

پھر وہ بیٹی سے بولا۔ "میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے کھلے رہیں گے۔ نہیں آؤ گی تو عدالت میں ملاقات ہوتی رہے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے وکیل کے ساتھ چلا گیا۔ مراد اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم بے سہارا نہیں ہو۔ میں نے تمہیں بہن کہا ہے' تم میرے والدین کے ساتھ رہو گی۔ اس طرح ان دونوں کو اپنی مرحومہ بیٹی کی جگہ تم مل جاؤ گی۔ بیٹی کی خالی جگہ تو پُر نہیں ہو سکے گی مگر تسلی ہو جائے گی۔"

وہاں کرن خورشید' خان اعظم خان' پرنسپل اور بلال احمد موجود تھے۔ بلال احمد نے کہا۔ "کمال ہے۔ یہ بڑے لوگ باکمال ہوتے ہیں۔ یہ کتنی آسانی اور بے غیرتی سے خود کو الزامات سے بچا کر بیٹی کو چھوڑ گیا ہے۔"

پرنسپل نے کہا۔ "آپ دیکھیں کہ تعلیم کے حوالے سے جرائم ہو رہے ہیں' مجرموں کا کچھ نہیں بگڑ رہا۔ ذہانت بیچنے والی ایک لڑکی کو قتل کر دیا گیا اور ذہانت بیچنے والے دوسرے طالب علم فہیم کو اسپتال پہنچا دیا گیا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "میں پہلے امی اور ماموں جان سے ملوں گی پھر فہیم سے ملنے اسپتال جاؤں گی۔ پرنسپل صاحب اور خان اعظم خان صاحب' آپ حضرات فہیم کی حفاظت نہ کرتے تو اسے بھی کرن ماہتاب کی طرح قتل کر دیا جاتا۔ شعبہ تعلیم تو کم از کم جرائم سے پاک رہنا چاہیے مگر کیا کیا جائے۔ بڑھتی ہوئی بے روزگاری غیر معمولی ذہانت رکھنے والے طلبہ کو بکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ بکنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ علم کی نفی کی جائے۔ اتنی بڑی دنیا میں ہزاروں قسم کے بازار ہیں جہاں انسان اپنی کوئی نہ کوئی چیز فروخت کرتا ہے۔

ایک علم کا بازار تو ایسا ہونا چاہیے جہاں انسان کسی فاحشہ کی طرح نہ بکے۔ پوری دیانت داری سے تعلیم حاصل کرنے کے مواقع حاصل کرتا رہے۔"

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر چپ ہو گئی۔ اس نے بدیع الزماں کو دیکھا' وہ انسپکٹر کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے آتے ہی اے ایس پی سے کہا۔ "آپ نے میرے بیٹے کو ہتھکڑی ڈال کر جو توہین کی ہے' وہ آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔"

اے ایس پی نے کہا۔ "یہ دھمکی آپ مجھے اپنی کوٹھی کے احاطے میں بھی دے سکتے تھے۔ اتنی سی بات کے لیے خواہ مخواہ یہاں آنے کی زحمت کی ہے۔"

"میں یہاں اپنے بیٹے کو لے جانے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟"

"لاک اپ میں آرام فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ بھی اسے ضمانت پر رہا کرنے کے لیے عدالت سے ہو کر آ رہے ہیں۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "عدالت میں مجرم جاتے ہیں۔ میرے بیٹے نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

کرن نے کہا۔ "میں اس کے جرم کی گواہ ہوں اور آپ بڑی ڈھٹائی سے اسے بے قصور کہہ رہے ہیں۔ کیا اس کے بے قصور ہونے کا کوئی ثبوت ہے؟"

"کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ اس نے تمہیں اغوا کیا تھا؟ کیا تمہیں اغوا کرنے والوں میں میرا بیٹا نظر آرہا تھا؟"

"یہ میاں بیوی آپ کے ملازم ہیں۔ یہ گواہ ہیں کہ آپ کے بیٹے کے حکم سے مجھے فارم ہاؤس کے مکان میں قید کیا گیا تھا۔"

"ان ملازموں کی اوقات کیا ہے؟ کسی دوسرے نے تمہیں اغوا کیا لیکن یہ غریب روپے پیسے لے کر لالچ میں تمہیں چھپانے کے لیے میرے فارم ہاؤس میں لے آئے۔ میں عدالت میں ثابت کر دوں گا کہ میرا بیٹا بے قصور ہے۔"

"تو پھر عدالت میں جائیں۔ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

وہ اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھ کر بولا۔ "اس سوال کا جواب پانچ منٹ کے اندر مل جائے گا۔"

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ پرنسپل نے کہا۔ "آپ آئندہ اپنے بیٹے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے فہیم کی ذہانت نہیں خرید سکیں گے کیونکہ اس خرید وفروخت کا بھید کھلنے ہی والا ہے۔"

"میرا بیٹا اپنی ذہانت کے بل پر کامیابیاں حاصل کرتا رہا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔"

"معلوم ہوتا ہے' آپ نے فہیم جیسے کسی دوسرے ذہین طالب علم کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔"

"آپ اپنے طور پر کوئی بھی رائے قائم کرسکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں بحث نہیں کروں گا۔"

فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ انسپکٹر نے ریسیور کان سے لگایا پھر دوسری طرف کی کچھ باتیں سنتے ہی۔ "یس سر!" کہتا ہوا اٹھ.......... کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ "جی۔جی.......... یہاں اے ایس پی صاحب موجود ہیں۔ جی' جی سر.........."

اس نے ریسیور اے ایس پی کو دیا۔ اس نے کان لگا کر کہا۔ "میں اے ایس پی طاہر علی بول رہا ہوں۔"

دوسری طرف سے کہا گیا۔ "مسٹر بدیع الزماں کے صاحب زادے کو چھوڑ دو۔ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے بغیر اسے لاک اپ میں نہ رکھو۔"

"لیکن سر! اغوا ہونے والی لڑکی اور اسے قیدی بنا کر رکھنے والے گواہ موجود ہیں۔"

"وہ عدالت میں جاکر ثبوت پیش کرتے اور گواہی دیتے رہیں گے میں حکم دے رہا ہوں۔ رئیس الزماں کو فوراً رہا کرو۔"

"لیکن سر.........."

"نو آرگومنٹس۔ جیسا میں کہہ رہا ہوں' ویسا کرو۔"

"آل رائٹ سر!"

اس نے ریسیور انسپکٹر کردے کر سپاہیوں سے کہا۔ "رئیس الزماں کو لاک اپ سے لے آؤ اور اسے جانے دو۔"

بدیع الزماں فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ سپاہی اس کے بیٹے کو لاک اپ سے لے آئے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میرا بیٹا آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا شہ باز ہے۔ پرندوں کو جال میں پھانسا جاتا ہے' باز کو نہیں۔ آؤ چلیں۔"

وہ ہنستا ہوا بیٹے کے ساتھ چلا گیا۔ کرن' ارم' مراد اکبر' پرنسپل' خان اعظم خان اور بلال احمد سب ہی انصاف حاصل کرنے کی توقع لے کر آئے تھے' وہ سب ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ انسپکٹر اور اے ایس پی کے سر جھکے ہوئے تھے۔

☆=========☆=========☆

وہ اپنی بیٹی کرن کے لیے رو رہی تھی۔ اس کے بھائی عبیدالرحمان نے کہا۔ "یہ شہر اس قابل نہیں رہا کہ شریف لوگ یہاں رہ سکیں۔ یہاں جوان لڑکیوں کی عزتیں محفوظ نہیں ہیں۔ مرد' بوڑھے' بچے قتل ہوتے رہتے ہیں۔ اتنی دہشت طاری رہتی ہے کہ سخت گرمی کے موسم میں بھی لوگ کھڑکیاں اور دروازے بند کرکے سوتے ہیں۔ بجلی چلی جائے تو تمام رات بچے روتے رہتے ہیں۔ ہم باہر کی تازہ ہوا کے لیے بھی ترستے رہتے ہیں۔"

"بھائی جان! جب اپنا دل صدمات سے چُور ہو تو ہم شہر کے حالات پر کیا آنسو بہائیں۔ یہ سوچ سوچ کر جان نکل رہی ہے کہ پتا نہیں' میری بیٹی کہاں ہوگی؟ اور اس کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہوگا؟"

"میں تو دن رات دعا کرتا رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کی عزت محفوظ رکھے۔ وہ خیریت سے ہو اور خیریت سے واپس آئے۔"

"ہم یہ بھی تو نہیں کہہ سکتے کہ میری بیٹی سے کس کی دشمنی تھی؟ یہاں تو کسی دشمنی کے بغیر بھی اغوا اور قتل ہوتے رہتے ہیں۔"

"پولیس والوں نے فہیم کو کتنی بے دردی سے مارا ہے۔ اگر اس کے پرنسپل وغیرہ نہ آگئے ہوتے تو شاید اسے مار ہی ڈالتے۔ موت کے خوف سے تو عادی مجرم بھی سچ اگل دیتے ہیں جب کہ وہ ایک بے ضرر طالب علم ہے۔ اگر اس نے کرن کو کہیں چھپایا ہوتا تو اتنی مار کھانے کے بعد جرم کا اقرار کرلیتا۔"

"ہاں۔ میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔ اس نے کرن کو اغوا نہیں کیا ہے۔ معلوم نہیں

اسپتال میں بیچارے کی حالت کیا ہوگی۔"

"ہمیں جاکر اس سے ملنا چاہیے۔ اسے جو بولنا ہے، بستر مرگ پر سچ بولے گا۔"

وہ دونوں بہن بھائی اپنے اپنے کمرے میں گئے پھر لباس تبدیل کر کے گھر کے دروازوں کو مقفل کر کے اسپتال کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ وہ فہیم کو غلط سمجھ رہے ہیں اور عقل بھی سمجھا رہی تھی کہ کرن اگر فہیم کے منصوبے کے مطابق کہیں چھپ کر رہتی تو اس کی اتنی بری حالت ہونے پر ضرور اس سے ملنے اسپتال آتی۔

اسے اذیت دینے والوں نے اس کے ایک پیر کی ہڈی پر اتنی ضربیں لگائی تھیں کہ وہ ٹوٹنے والی تھی۔ تڑخ گئی تھی۔ اس پیر پر پلاسٹر چڑھایا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں کلائیوں اور کہنیوں کے درمیان سے توڑ دی گئی تھیں۔ ان پر بھی پلاسٹر چڑھایا گیا تھا.......... کرن کی ماں اور ماموں نے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اسے دروازے پر کھڑے رہ کر دیکھا۔ وہ بستر پر پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ چہرے سے برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔ کرن کی ماں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔ "یا اللہ! کیا اس طرح ظلم کیا جاتا ہے؟"

عبیدالرحمان نے کہا۔ "ہماری بیٹی ہمیں نہیں ملی مگر اسے ایسی سزا مل رہی ہے کہ دیکھا نہیں جاتا۔ دیکھو تو شرم آتی ہے۔ واقعی ظلم کرنے والے انسانی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جسے چاہتے ہیں، مچھر اور کھٹمل کی طرح مار ڈالتے ہیں۔"

"یہ سو رہا ہے۔ ہمیں جانا چاہیے پھر کبھی آئیں گے۔"

وہ واپس جانا چاہتے تھے۔ فہیم نے آنکھیں کھول کر کہا۔ "میں جاگ رہا ہوں، آجائیں۔"

وہ جاتے جاتے رک گئے پھر کمرے کے اندر اس کے بیڈ کے قریب آئے۔ کرن کی ماں کو دیکھ کر فہیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولا۔ "آپ کے آنے سے خوشی ہو رہی ہے مگر آپ کو دیکھ کر کرن اور زیادہ یاد آنے لگی ہے۔ میں ہر آنے والے سے پوچھتا ہوں، کیا وہ گھر آگئی ہے؟ مگر جواب "نہیں" میں ملتا ہے۔ میں یہی سوال آپ سے کر رہا ہوں۔"

کرن کی ماں اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔ وہ سرد آہ بھر کر بولا۔ "جواب مل گیا۔"

عبیدالرحمان نے کہا۔ "بیٹے! ہمارا دل کہتا ہے کہ تم ایسی مجرمانہ حرکت نہیں کرسکتے۔ پولیس والوں کو بھی تم پر اتنا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"انکل! مجھ پر جو گزر رہی ہے، گزرنے دیں۔ اب تو میں پہلے سے بہت ٹھیک ہوں۔ پہلے تو میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ اب صاف طور پر بولنے لگا ہوں۔ آپ یہ تو جانتے ہوں گے کہ کرن کی بازیابی کے لیے کیا، کیا جارہا ہے۔"

"سب ہی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہم بھی اور پولیس والے بھی ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ تمہارے پرنسپل اور خان اعظم خان صاحب کو شبہ ہے کہ اس رئیس زادے رئیس الزماں نے اسے اغوا کیا ہے لیکن شبہ کرنے سے وہ مل تو نہیں جائے گی۔"

اسی وقت پرنسپل خان اعظم خان کمرے میں داخل ہوئے۔ پرنسپل نے کہا۔ "ہمارا شبہ درست نکلا۔ اس رئیس زادے ہی نے کرن کو اغوا کرایا تھا۔ تم خوش خبری سن کر بستر سے نہ اٹھنا وہ واپس آگئی ہے۔ یہاں اسپتال کے کمرے کے باہر ہم نے اسے روک کر رکھا ہے تاکہ تم اپنی مسرتوں اور جذبات پر قابو رکھ سکو۔"

یہ سنتے ہی کرن کی ماں اور ماموں کمرے سے باہر آئے۔ کرن ذرا فاصلے پر ارم اور مراد اکبر کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی گلے لگ گئی۔ ماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ عبیدالرحمان بھانجی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ بولی۔ "میں ابھی گھر گئی تھی۔ وہاں دروازے پر تالا دیکھ کر یہاں آئی ہوں۔"

ماں نے روتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹی! تم تین دنوں سے کہاں تھیں؟ میں تو تمہارے بغیر زندہ لاش بنی ہوئی تھی۔"

کرن نے ارم اور مراد اکبر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ میرے محسن ہیں۔ ان سے آپ کو بہت کچھ معلوم ہوجائے گا۔ مجھے فہیم کے پاس جانے دیں۔"

وہ تیزی سے چلتے ہوئے کمرے کے دروازے پر آکر ٹھٹک گئی۔ وہیں سے نظر آگیا تھا کہ محبوب پر کتنا ظلم کیا گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ فہیم نے اسے دیکھ

کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس اب مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم آگئی ہو۔ اب موت بھی آئے گی تو اطمینان اور سکون سے مرسکوں گا۔"

وہ دوڑتے ہوئے اس کے قریب آئی پھر اس سے لپٹ کر رونے لگی اور کہنے لگی "یہ کیا ہو گیا فہیم؟ اللہ اسے غارت کرے۔ اس نے رقابت میں تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرایا۔ اپنی دولت کے غرور میں تمہارا یہ حال کرایا ہے۔ اب وہ میرے سامنے آئے گا تو میں اس پر تھوک دوں گی۔ اس سے زیادہ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟"

خان اعظم خان نے کہا۔ "بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن فہیم انہیں محسن سمجھتا ہے۔ اس کے ماں باپ انہیں فرشتہ کہتے ہیں۔ یہ ان کے خلاف کبھی یہ نہیں کہے گا کہ وہ دولت سے اس کی ذہانت خریدتے رہے ہیں۔"

کرن نے فہیم سے الگ ہو کر کہا۔ "ہاں میں بھی سمجھ گئی ہوں کہ تم نے دوسرا نام رئیس الزماں کیوں رکھا تھا؟ اور تم نے بورڈ کے امتحانات نہ دے کر اس لیے اپنا ایک سال ضائع کیا تھا کہ اس سال تم بدیع الزماں کے بیٹے رئیس الزماں کے نام سے امتحانات دے رہے تھے اور اس نااہل کو اے ون گریڈ کا سرٹیفکیٹ دلایا تھا۔"

وہ بولا۔ "کرن! کوئی اور بات نہ کرو۔ صرف اپنی بات کرو۔ تمہیں زندہ سلامت دیکھ کر میں اپنی تکلیف بھول گیا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے وہ شعر یاد آرہا ہے۔

راہ دشوار کی جو دھول نہیں ہوسکتے
ان کے ہاتھوں میں کبھی پھول نہیں ہوسکتے"

کرن کی ماں اور ماموں کمرے میں آگئے۔ مراد اکبر دروازے پر کھڑا فہیم کو دیکھ رہا تھا۔ ارم نے اس سے کہا۔ "آؤ کمرے میں چلیں۔"

مراد اکبر نے انکار میں سر ہلا دیا پھر پلٹ کر کوریڈور میں آگیا۔ ارم نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

وہ بولا۔ "تم نے پولیس اسٹیشن میں تماشا دیکھا تھا۔ تمہارا باپ اپنا بچاؤ کرنے کے لیے تمہارے اوپر کیچڑ اچھال کر چلا گیا۔"

"مجھے یاد نہ دلاؤ۔ مجھے شرم آتی ہے۔ میں ان لمحات کو بھولنا چاہتی ہوں۔"

"یہی ہماری خرابی ہے کہ ہم برائی کو اور برا کرنے والوں کو ذہن سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح پھر کبھی دوسری برائی کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ چلو میں تمہاری بات نہیں کرتا لیکن وہ کرن جو اپنی جان اور آبرو بچا کر قانون کا سہارا لینے آئی' اسے کیا مل رہا ہے؟ وہ اغوا کرنے والے مجرم کی نشاندہی کر رہی ہے۔ گواہ کے طور پر مجرم کے ملازموں کو پیش کر چکی ہے۔ اس کے باوجود بدیع الزماں اپنے بیٹے کو حوالات سے نکال کر لے گیا ہے۔"

"واقعی یہ ماننا پڑتا ہے کہ دولت' اثر و رسوخ اور بے جا اختیارات کے سامنے قانون اور قانون کے محافظ بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔"

"مگر میں بے بس نہیں ہوں۔"

"تم کیا کرو گے؟"

"کچھ تو کروں گا۔ میں فہیم کی طرح بے بس نہیں ہوں۔ تم نے دیکھا ہے' اس کی کتنی بری حالت کر دی گئی ہے۔ اسپتال سے نکلنے کے بعد وہ لنگڑا کر چلے گا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھاری بوجھ اٹھا نہیں سکیں گے۔ شاید اس ذہین طالب علم کی انگلیاں قلم پکڑنے کے قابل نہ رہیں۔ اس کا مستقبل' اس کی پوری زندگی برباد کر دی گئی ہے۔ کوئی ہے اس سے انصاف کرنے والا؟"

"تمہیں اس سے ہمدردی ہے پھر اس کے پاس کیوں نہیں جا رہے ہو؟"

"اس کے پاس جو بھی جا رہا ہے' اس پر ترس کھا رہا ہے۔ میں ترس کھاتا ہوں اور نہ ترسنا جانتا ہوں' صرف برسنا جانتا ہوں۔ انشاء اللہ برس کے دکھاؤں گا۔"

ارم نے دیکھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے خلا میں تک رہا تھا۔ بالکل خاموش تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا پورا وجود اندر سے گرج رہا ہو اور اب برسنے والا ہو۔

☆=========☆=========☆

بدیع الزماں اپنی بیگم اور اپنے بیٹے کے ساتھ ناشتے کی میز پر تھا۔ ایک ملازم نے آکر کہا۔ "جناب! تین بندے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ ایک نے یہ پرچی دی ہے۔"

بدیع الزماں نے پرچی لے کر پڑھی۔ اس پر انٹیلی جنس کے چیف افسر بلال احمد کا نام تھا۔ وہ ملاقات کرنے آیا تھا۔ اس نے کہا۔ "انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔ سیکیورٹی افسر

سے کہو۔ وہ بھی گارڈز کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر الرٹ رہے۔"

ملازم چلا گیا۔ رئیس الزماں نے کہا۔ "ڈیڈی! آپ......... پولیس والوں سے تو نمٹ چکے ہیں اب انٹیلی جنس والے آئے ہیں۔"

وہ چائے پینے کے بعد بیٹے کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آیا پھر بلال احمد کو دیکھ کر مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو آپ ہیں۔ اس روز میں نے آپ کو کرن کے ساتھ دیکھا تھا تھانے میں۔ فرمائیے کیسے زحمت کی؟"

"آپ کے صاحب زادے سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ کیا دو برس پہلے انہوں نے بورڈ کا امتحان دیا تھا؟"

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کوئی مشکل سوال نہیں کر رہا ہوں۔ رئیس الزماں سے کہتا ہوں' یہ ایک کاغذ پر یہ لکھ کر دے دے کہ اس نے بورڈ کے امتحانات کے تمام پرچے خود حل کیے ہیں۔"

"اگر یہ نہ لکھ دے تو؟"

"تو میں اسے عدالت میں بلا کر لکھواؤں گا اور یہ ثابت کروں گا کہ امتحانات میں جو پرچے حل کیے گئے ہیں ان کی تحریر اور آپ کے بیٹے کی تحریر میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ پرچے فہیم نے رئیس الزماں کے نام سے حل کیے تھے اور عدالت میں جو تحریر آپ کے بیٹے کی ہوگی' وہ تحریر اس سال کے امتحانات میں کسی پرچے میں نظر نہیں آئے گی۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "سمجھ گیا۔ آپ دور کی دوڑی لائے ہیں۔ آپ نے دو برس پہلے کے پرچے برآمد کیے ہیں۔ ان کے ذریعے آپ بہ آسانی ثابت کر سکیں گے کہ ان پرچوں پر فہیم کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ میرے بیٹے کی تحریر اس سے بالکل مختلف ہے۔"

"جی ہاں۔ اب میں یہ ثابت کر سکوں گا کہ آپ کا بیٹا تعلیم میں کند ذہن ہے۔ اس کی جگہ فہیم نے رئیس الزماں بن کر امتحانات دیئے اور اسے اے ون گریڈ کا سرٹیفکیٹ دلایا ہے۔"

رئیس الزماں نے پریشان ہو کر اپنے باپ کو دیکھا۔ باپ سوچنے کے انداز میں بلال

احمد کو دیکھ رہا تھا پھر وہ صوفے سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا ایک طرف آ گیا۔ وہاں سے پلٹ کر بولا "بھئی کمال ہے' بلال احمد صاحب! آپ اتنا زبردست اور ٹھوس ثبوت لائے ہیں کہ میرا بیٹا ایک غریب ذہین طالب علم کی ذہانت خریدنے والا مجرم ثابت ہو جائے گا۔"

بلال احمد نے کہا۔ "آپ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اب بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کا بیٹا ایک کاغذ پر تحریری طور پر اعتراف کرے کہ اس نے تعلیمی سند حاصل کرنے کے لیے مجرمانہ طریقہ اختیار کیا تھا اور اب بھی یہی کر رہا ہے۔"

"ہوں۔" بدیع الزماں نے بلال احمد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب بلال احمد.........! آپ بہت ذہین اور تجربہ کار ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کیس پر مٹی ڈال دی جائے اور یہ معاملہ یہیں ختم کر دیا جائے۔"

"سوری۔ آپ مجھے کسی طرح کا بھی لالچ دے کر اپنا اور میرا وقت ضائع کریں گے۔"

"آپ نے دیکھا تھا کہ میں اپنے بیٹے کو کس طرح حوالات سے نکال کر لایا تھا۔"

"جی ہاں۔ آپ نے بہت اوپر سے سفارش حاصل کی تھی۔ اب بھی یہی کریں گے تو میں استعفیٰ دے دوں گا لیکن آپ باپ بیٹے کو عدالت میں ضرور بلاؤں گا۔"

"ہوں' اب تو ہم بری طرح پھنس گئے۔ ہمیں بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ملے گا پھر بھی میں آخری بار پوچھ رہا ہوں' اس معاملے کو ختم کرنے کے لیے کوئی سمجھوتا ہو سکتا ہے؟"

"بالکل نہیں' کوئی سمجھوتا نہیں۔ کوئی رشوت کام نہیں آئے گی۔ میں رئیس الزماں سے کہتا ہوں' یہ ایک کاغذ پر اپنی تحریر پیش کرے۔"

رئیس الزماں نے باپ سے کہا۔ "ڈیڈی! میں نہیں لکھوں گا۔"

بدیع الزماں نے صوفے پر بیٹھ کر کہا۔ "ہاں بیٹے! تم کچھ نہیں لکھو گے۔ بات یہ ہے بلال صاحب کہ میرے بیٹے نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد یہ بیمار رہنے لگا اس لیے آگے نہ پڑھ سکا۔ اب یہ بیچارہ ایسی اچھی اردو انگریزی لکھ نہیں سکتا جیسی آپ لکھوانا چاہتے ہیں۔"

بلال احمد نے چونک کر پوچھا۔ "کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے کے پاس

اے ون گریڈ کا سرٹیفکیٹ نہیں ہے؟"

"جب اس نے دسویں کا امتحان ہی نہیں دیا تو اس کے پاس سرٹیفکیٹ کہاں سے آئے گا؟"

"اگر اس نے دسویں جماعت پاس نہیں کی ہے تو پھر کالج میں کیسے پڑھ رہا ہے؟"

بدیع الزماں نے کہا۔ "میں اس کالج کو لاکھوں روپے عطیات کے طور پر دیتا ہوں۔ اس کالج کی انتظامیہ میرے زیر اثر ہے۔ آپ وہاں انکوائری کے لیے جائیں گے تو سب ہی کا یہ بیان ہوگا کہ میرا بیٹا وہاں نہیں پڑھتا۔ آپ ذرا عقل سے کام لیں۔ میرے بیٹے نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے' وہ کالج میں کیسے پہنچے گا؟"

پھر اس نے ملازم سے کہا۔ "یہاں کیوں کھڑے ہو' اتنے بڑے افسر آئے ہیں' چائے لے کر آؤ۔"

بلال احمد نے صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ' چائے کا تکلف نہ کریں۔ میں اخبارات کے لیے یہ خبر لے کر جارہا ہوں کہ آپ جیسے رئیس اعظم کے صاحب زادے نویں جماعت کے بعد تعلیم سے محروم ہو چکے ہیں۔ اگر یہ کبھی اونچی جماعتوں کی ڈگریاں پیش کریں تو انہیں فراڈ سمجھا جائے۔ بے چارے کی شخصیت سے تعلیم کا روغن اتر گیا ہے۔ اب یہ پرانی شکستہ عمارت کی طرح نظر آئے گا۔"

بلال احمد اپنے ماتحتوں کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رئیس الزماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "ڈیڈی! یہ آپ نے کیا کیا؟ اپنے بیٹے کی شخصیت کو کم تر بنا دیا۔"

"بیٹے! میں وقتی طور پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک تو وہ زبردست ٹھوس ثبوت لے کر آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ استعفیٰ دینے کے بعد بھی کسی سرکاری دباؤ میں نہیں آئے گا۔ ہمیں عدالت میں گھسیٹے گا۔ اس کا بس یہی ایک توڑ تھا۔"

"میں مانتا ہوں آپ نے حالات سے مجبور ہو کر ایسا کیا ہے لیکن سوسائٹی میں میری بڑی سبکی ہوگی۔"

"مجرمانہ اعمال کو پوشیدہ رکھنے کے لیے ایک چھوٹی سی شکست کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ اعلیٰ تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے........ اور بھی کئی ہتھکنڈے ہیں۔ اگر یہاں

کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی تو تمہیں ملک سے باہر بھیج کر تمہارے لیے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کروں گا۔ فکر نہ کرو۔ جس ملک میں قومی خزانہ لوٹنے والوں کا محاسبہ نہیں ہو پاتا' وہاں ہمارا محاسبہ کرنے والے بھی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔"

بیٹا مطمئن ہو کر مسکرانے لگا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بدیع الزماں نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "ہیلو کون ہے؟"

دوسری طرف سے مراد اکبر کی آواز آئی۔ "میں نے تمہیں آواز سے پہچان لیا ہے۔ تم بدی الجمع ہو۔ تمہارے والدین نے درست نام رکھا ہے۔ بدی الجمع یعنی برائیوں کا مجموعہ........"

وہ گرج کر بولا۔ "کون ہو تم؟ یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"ہماری دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ ہر چیز کا اختتام ہے۔ تمہاری برائیوں کا بھی لازمی خاتمہ ہو گا۔"

"کیا تم نے یہی بکواس کرنے کے لیے فون کیا ہے؟"

اسے جواب نہیں ملا۔ بدیع الزماں ہیلو ہیلو کہتا رہ گیا پھر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔

☆=========☆=========☆

فہیم بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے سرہانے پر ایک طرف اس کے والدین کھڑے تھے۔ وہیں سرہانے دوسری طرف کرن اپنی ماں اور ماموں کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان کے علاوہ پرنسپل اور بلال احمد بھی تھے۔ بلال احمد بورڈ کے امتحانات کے وہ پرچے لے آیا تھا جن میں فہیم کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ وہ اسے ایک ایک پرچہ کھول کر دکھا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "کیا تم انکار کر سکو گے کہ یہ تمہاری تحریر نہیں ہے؟ اور تم نے رئیس الزماں کو اونچے درجے کا سرٹیفکیٹ دلانے کے لیے ایسا نہیں کیا تھا؟"

فہیم کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ ٹھوس اور کھلی حقیقت کے سامنے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ بلال احمد نے اس کے والدین سے کہا۔ "آپ بدیع الزماں کو فرشتہ کہتے ہیں۔ اس فرشتے نے صاف طور پر کہہ دیا ہے کہ اس کے بیٹے نے نویں جماعت سے آگے تعلیم حاصل نہیں کی ہے۔ اس کے اس بیان کے بعد تمام الزام آپ کے بیٹے فہیم پر آتا ہے کہ اس

نے رئیس الزماں کے نام سے شناختی کارڈ بنوایا۔ بورڈ کے ایڈمٹ کارڈ میں اپنی تصویر لگائی اور رئیس الزماں کے نام سے پرچے حل کیے اور اپنے اصل نام فہیم الزماں سے دوسرے برس بورڈ کے امتحانات دیئے۔"

فہیم کے باپ نے کہا۔ "ہم تو یہ سمجھتے رہے کہ وہ بڑی رقمیں دے کر ہماری مصیبتیں دور کر رہا ہے اور اس کے بدلے ہمارا بیٹا اس کے بیٹے کو امتحانات میں کامیاب کراتا ہے اور یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔"

"بہت بری بات ہے۔ محکمۂ تعلیم سے فراڈ ہے۔ یہ ایسا جرم ہے جس کے ذریعے نااہل رہنے والے خود کو اہل اور تعلیم یافتہ ثابت کرتے ہیں اور حکومت کے اہم شعبوں میں پہنچ کر ملک و قوم کو تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں آجانا چاہیے کہ بدیع الزماں اور اس کا بیٹا رئیس الزماں مجرم نہیں کہلائیں گے۔ ان کے بیان کے مطابق رئیس الزماں نے صرف نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی ہے۔ فہیم نے دو برسوں میں دو مختلف ناموں سے بورڈ کے امتحانات کیوں دیئے؟ اس نے اپنی ذہانت کیسے فروخت کی؟ جب اس نے ایسا کیا ہے تو پھر یقیناً کسی نااہل کو اہل بنانے کا جرم کیا ہے۔ میں اس کیس کو عدالت میں لے جاؤں تو اصل مجرم بچ نکلیں گے اور صرف فہیم گرفتار ہوگا۔ اب میں اسے گرفتار کروں؟ قانون کے محافظوں نے اسے پہلے ہی مار مار کر اپاہج بنا دیا ہے۔"

پرنسپل نے کہا۔ "آپ اس کیس کو آگے نہ بڑھائیں۔ وہ بڑے لوگ اپنی شاطرانہ چالوں سے اپنے جرائم پر پردہ ڈال کر بچ نکلتے ہیں۔ فہیم جیسے غریب لوگ ہی ان کی چالوں میں آتے ہیں اور سزائیں پاتے ہیں۔ میں فہیم کی ضمانت لیتا ہوں۔ یہ آئندہ اپنی ذہانت فروخت نہیں کرے گا۔"

کرن نے کہا۔ "ایسے دولت مند جو اپنی سطح سے نیچے آکر لین دین کرتے ہیں' وہ نہایت ہی خود غرض ہوتے ہیں۔ جب تک ہم سے بہت کچھ حاصل ہوتا رہے تب تک خیرات کے طور پر ہماری ضرورتیں پوری کرتے ہیں پھر ہمیں کسی دلدل میں پھینک کر ہمارے دھنسنے اور مرنے کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔"

پرنسپل نے کہا۔ "ہم دوسروں کو الزام کیوں دیں؟ اپنی عقل سے یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ تعلیمی ڈگریوں کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ ایک جاہل اور ناخواندہ شخص مجرمانہ طریقوں سے لاکھوں کروڑوں روپے کما سکتا ہے لیکن ایک تعلیمی سند حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے حاصل کرنے کے لیے علوم کا خزانہ چاہیے اور تمہارے جیسے ذہین طلبہ چند ہزار روپے کے عوض یہ خزانہ کسی جاہل سرمایہ دار کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔"

"سر! جب مہنگائی اور بے روزگاری بڑھ جاتی ہے تو جرائم کے نئے نئے راستے کھلتے جاتے ہیں۔ ہر طرح کے مریض کے لیے جگہ جگہ اسپتال ہیں لیکن مہنگائی اور بے روزگاری کے مریضوں کے لیے ایک چھوٹی سی ڈسپنسری بھی نہیں ہے۔ ایسے میں مریض غلط دوائیں ضرور استعمال کرے گا۔"

پرنسپل نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ "ہاں ایسے امراض کے ڈاکٹر اسمبلیوں میں سو رہے ہیں۔ نہ جانے کب بیدار ہوں گے۔ یہ بھی تو سوچو کہ تمہارے جیسے ذہین طلبہ نے تو انہیں وہاں تک پہنچنے کی ڈگریاں نہیں دیں۔"

وہ خاموش رہے۔ پرنسپل نے کہا۔ "علم کی سند صرف اسے ملے جو علم کے مطابق عمل کرے کسی بھی ناخواندہ کو کبھی علمی سند نہیں دی جاتی۔ جس ناخواندہ نے کبھی بھی علمی سند حاصل کی' اس نے اپنے ساتھ پوری قوم کو ڈبو دیا۔"

پرنسپل کہہ رہے تھے اور ان سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ فہیم ہو یا کرن یا ان کے والدین' سب ہی سمجھ رہے تھے کہ ہم اپنی قوم کو ڈبو رہے ہیں۔

☆=========☆=========☆

حالات اچھے ہوں یا برے' بڑے لوگوں کے تفریح کے مشغلے جاری رہتے ہیں۔ ایک بار پھر موٹر سائیکل ریس ہو رہی تھی۔

پچھلی بار رئیس الزماں ریس میں اول آیا تھا۔ اس بار ایک دوسرے رئیس زادے نے اسے چیلنج کیا تھا اور پچاس ہزار روپے کی شرط لگائی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ان کے رئیس بزرگوں کا ہجوم تھا۔ وہ ہار جیت کا تماشا دیکھنے اپنی اپنی کار میں آئے تھے۔ اس بھیڑ میں مراد اکبر اور اس کے ساتھی بھی ایک گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے۔

اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ "یار مراد! اس کے باپ بدیع الزماں کو دیکھ' کتنا خوش نظر آرہا ہے۔ ہر مقابلہ' ہر بازی کا نتیجہ نکلنے سے پہلے اسے یقین ہوتا ہے کہ جیت اسی کی ہوگی۔"

مراد اکبر نے اثبات میں سرہلا کر کہا۔ "ہاں وہ بھول جاتا ہے کہ زندگی کی ریس میں جیت ہمیشہ موت کی ہوتی ہے۔"

دوسرے ساتھی نے کہا۔ "ویسے زبردست چال باز ہے۔ اپنے گن مین ملازم اور اس کے بیوی بچے کو کہیں غائب کرکے کرن کے اغوا کے کیس کو سرد خانے میں ڈال دیا ہے۔ اب کوئی ثبوت یا گواہ نہیں رہا کہ کرن کو.......... رئیس الزماں نے اغوا کرایا تھا۔"

"بھئی سیاست یہی لوگ جانتے ہیں۔ اس نے مجرمانہ طریقے سے تعلیمی اسناد حاصل کرنے کے الزام سے بھی بیٹے کو بچالیا ہے۔"

"یہ مکار لوگ تعداد میں کم ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں کروڑوں کی تعداد میں عوام ہوتے ہیں لیکن ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

موٹر سائیکل ریس شروع ہوگئی۔ ابتدا ہوتے ہی رئیس الزماں اپنے مقابل سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اس کے پیچھے ایک طویل فاصلہ رکھتے ہوئے بہت سی کاریں چلنے لگیں۔ صرف مراد اکبر کی گاڑی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ وہ اور اس کے ساتھی گاڑی سے باہر آگئے۔ اپنی گھڑیاں دیکھنے لگے۔ انہیں صرف دو منٹ گزرنے کا انتظار تھا۔

صدیاں گزر جاتی ہیں۔ دو منٹ گزرنے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔ جیسے ہی دوسرا منٹ گزرا' اس کے ساتھ ہی رئیس الزماں کی موٹر سائیکل ایک زوردار دھماکے سے فضا میں اُڑ گئی پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر دور تک بکھرتی چلی گئی۔ باپ کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ ایک اندھے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ بیٹا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کہاں گیا ہے؟ یا کہیں چھپ گیا ہے۔ باپ سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد سرپرائز دینے کے لیے اچانک سامنے آجائے گا۔ موت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اچانک آئے تو اس کے آکر گزر جانے کا یقین نہیں ہوتا۔

پیچھے آنے والی کاریں رک گئیں تھیں' واپس ہونے کے لیے ایک دوسرے سے

ٹکرا رہی تھیں۔ عورتیں' مرد اور بچے جو سڑک کے اطراف تھے' وہ چیخیں مارتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ مراد اکبر اور اس کے ساتھی گاڑی میں بیٹھ گئے پھر واپس جانے لگے۔

اب وہاں پولیس والے اپنی ڈیوٹی کے مطابق کارروائیاں کرنے والے تھے۔ دور دور تک بکھرے لاش کے ٹکڑے جمع کئے جا رہے تھے۔ یہ واردات شام کو ہوئی تھی۔ رات کو جسم کے تمام اعضاء سمیٹ کر کوٹھی میں پہنچا دیئے گئے۔ انہیں دیکھ کر رئیس الزماں کی شناخت نہیں ہو رہی تھی۔ چہرہ بھی ثابت و سالم نہیں رہا تھا۔ وہ رئیس ماں باپ اتنے بدنصیب ہوگئے کہ بیٹے کا آخری دیدار بھی نہ کرسکے۔

امیر کبیر خاندان والوں کی طرح رئیس الزماں کی موت کی اطلاع سمندر پار رہنے والوں کو دی جانے لگی۔ دوسرے دن صبح ہزاروں افراد اس کے جنازے کو کاندھا دینے آئے۔ اس وقت فون کی گھنٹی بجی۔ سیکریٹری نے ریسیور اٹھا کر پوچھا۔ "کون ہے؟" دوسری طرف سے مراد اکبر کی آواز آئی۔ "اپنے صاحب کو فون دو۔"

"سوری۔ وہ صدمے سے نڈھال ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرسکیں گے۔"

"مجھ سے کریں گے کیونکہ میں ان کے مقتول بیٹے کے بارے میں ایک اہم بات کہنے والا ہوں اور یہ بات صرف ان سے ہی کہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ان سے کہتا ہوں' آپ ہولڈ کریں۔"

دوسری طرف سے مراد اکبر نے انتظار کیا پھر بدیع الزماں کی صدمے سے بھری آواز آئی۔ "ہیلو۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اپنے مرنے والے عزیزوں کی خواہشات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ جب انہیں قبر میں اتارا جاتا ہے تو محبت اور عقیدت کے طور پر ان کے سرہانے ایسی چیزیں رکھی جاتی ہیں جنہیں وہ زندگی میں بے حد عزیز رکھتے تھے۔"

بدیع الزماں نے کہا۔ "ہاں۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو گلاب کے پھول بہت پسند تھے۔ میں تازہ پھول اس کے سرہانے رکھوں گا۔"

"آپ بھول رہے ہیں' آپ کے صاحب زادے کو گلاب سے بھی زیادہ اے ون گریڈ کا تعلیمی سرٹیفکیٹ عزیز تھا۔ آپ نے اسے فہیم سے لے کر جہاں چھپا رکھا ہے' وہاں

سے نکال کر اب بیٹے کے سرہانے قبر میں چھپا دیں۔"

وہ ایک بارگی گرج کر بولا۔ "یو شٹ اپ۔ کون ہو تم؟ تم میرے بیٹے کے قاتل ہو۔"

"میں ایک بار فون پر کہہ چکا ہوں۔ اس دنیا میں ہر چیز کا اختتام ہوتا ہے لیکن تم باپ بیٹے کو اپنی موت کا یقین نہیں تھا۔ بہرحال دو میں سے ایک کا خاتمہ ہو چکا ہے۔"

فون بند ہو گیا۔ بدیع الزماں پھر گرجنا چاہتا تھا لیکن بیٹے کے ختم شد پر روتے روتے ریسیور کو ایک طرف پھینک دیا۔ شام کو وہ جنازہ ہزاروں افراد کے کاندھوں سے گزرتا ہوا قبر تک پہنچا۔ جسم کے بکھرے ہوئے حصوں کو کفن میں رکھ کر اس کی گٹھڑی بنا دی گئی تھی۔ اسے قبر میں اتار دیا گیا۔ باپ ایک طرف کھڑا اس قبر کو بند ہوتے دیکھتا رہا۔ سب لوگ مٹی ڈالنے لگے۔ آخر میں قبر کے سرہانے کتبہ نصب کیا گیا۔ بدیع الزماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں اور اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

اسی وقت ایک شخص ہجوم کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھا اور بدیع الزماں کے قریب پہنچ کر اسے آہستگی سے اپنی طرف متوجہ کیا۔

صدمے سے بے حال بدیع الزماں نے مڑ کر اسے دیکھا' اس شخص نے گھبرائے ہوئے لہجے میں سرگوشی میں کہا۔ "صاحب' بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ یہ پرچا پڑھ لیں۔"

بیگم کی طبیعت کی خرابی کا سن کر بدیع الزماں نے جلدی جلدی پرچا کھولا۔ اس دوران میں وہ شخص بھیڑ کے درمیان اپنا واپسی کا سفر شروع کر چکا تھا۔

بدیع الزماں نے آنکھوں سے آنسو پونچھ کر دھندلے لفظوں کو واضح کیا اور پڑھنا شروع کیا' لکھا تھا۔ "بیگم صاحبہ خیریت سے ہیں مگر آپ صدمے سے اتنے نڈھال ہیں کہ بیٹے کے سرہانے لگے ہوئے کتبے کو بھی نہیں پڑھ سکے۔"

بدیع الزماں نے چونک کر سر اٹھا کر کتبے کی طرف دیکھا۔ وہاں عام کتبوں کی طرح مرنے والے کی تاریخ پیدائش اور وفات لکھی ہوئی تھی لیکن وہ نام پڑھ کر چونک گیا۔ وہاں لکھا ہوا تھا۔ "رئیس الزماں ولد بدی اجمع.........."

جو برائیوں کا مجموعہ تھا' اس کی تمام برائیوں کو قائم رکھنے والی آئندہ نسل ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی ٹانگیں لرز گئیں۔ وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ بیٹے کی قبر پر گر پڑا۔

===========ختم شد===========